جدید
اردو لسانیات
خزینہ اردو زبان وادب
ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین

جدید اُردو لسانیات

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
صدر شعبۂ اردو
میرٹھ یونی ورسٹی میرٹھ

آپ کی پہلی تصنیف لائق مبارک باد ہے۔ میں ہمیشہ ہی آپ کا دُعا گو رہا ہوں۔ خدا آپ کے مراتب بُلند فرمائے۔

استاذی پروفیسر گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

آپ کی تازہ تصنیف نے تازہ دم کیا۔ بیحد پسند آئی۔ آپ نے صحیح لکھا ہے میرا بھی احساس یہی ہے کہ یہ طلباء و اساتذہ دونوں کو ابتدائی لسانیات کی معلومات بخوبی بہم پہنچائے گی۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔

میں آپ کی قلم کاری کا قائل ہوں واقعی آپ کے قلم میں بڑی جان ہے۔ خشک موضوع کو یہ دل آویزی عطا کر دینا آپ ہی کا کام ہے۔

پروفیسر خلیق انجم
سیکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

آپ کی کتاب جامع اور بلیغ ہے۔ اس موضوع پر موجود بیسوں کتابیں مسئلہ کو اُلجھا تو دیتی ہیں۔ سُلجھانے کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے۔ میں کہوں گا کہ یہ اُردو میں بلوم فیلڈ کی تصنیف کے مانند ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں
جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی۔

ناشر : چغتائی پبلشرز ۶، مفتی اسٹریٹ میرٹھ

مطبوعہ :- دوسرا ایڈیشن ۔ جمال پریس دہلی۔

قیمت :- پندرہ روپے =/۱۵

کتابت :- رہبر الماسی رام پوری

ملنے کے پتے

چغتائی پبلشرز ۶، مفتی اسٹریٹ میرٹھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵...۱۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶...۱۱

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳...۴

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

موضوعات

والدِ محترم کے نام

جن کی علم پروری، سخت کوشی اور ذہنی و جسمانی صحت نے مجھے مشکل پسندی اور سخت کوشی کی تعلیم دی۔

دیگر تصانیف

۱۔ فنِ سوانح نگاری
۲۔ اردو اسالیبِ نثر
۳۔ سیر المصنفین (مرتبہ)
۴۔ اربابِ نثر اردو (مرتبہ)
۵۔ کلیاتِ دلمیر (زیرِ طبع)

پیشِ لفظ

اردو لسانیات کے مطالعے میں دو چیزیں اہم ہیں۔ ایک اردو، دوسرے لسانیات یہاں مرکزی خیال اردو ہے۔ اردو کے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور و فکر اس کتاب کا اصل موضوع ہے اردو کے ماضی سے واقفیت کے لیے ان تاریخی حالات کا جاننا ضروری ہے جن سے زبانوں کا ہند آریائی قافلہ مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا اردو کے مرحلے میں داخل ہوا۔ ماضی میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اردو کی تہہ میں کون سی بولی یا بولیاں ہیں ان بولیوں کا تعلق کس اپ بھرنش سے ہے اس اپ بھرنش کا سلسلہ کس پراکرت سے جا ملتا ہے پراکرتوں کی ادبی و مذہبی روایت قدیم ویدک کال کی سنسکرت سے کیوں کر جڑی ہوئی ہے کیا واقعی اردو سنسکرت کی یا پرنواسی پرپوتی ہے؟

ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے کے بعد لسانی طور پر جو زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں کئی سیاسی، سماجی اور ادبی انقلاب آئے ان کے ڈھانچوں کی تبدیلی نے کبھی کسی بولی کو ابھارا، کسی کو اکھاڑا، کسی کو چڑھایا، کسی کو گرایا۔ اردو پر کیا گزری؟ کبھی شمال میں اس کی قدر ہوئی، کبھی جنوب میں

کبھی دلی میں تو کبھی لکھنؤ میں اس کی پذیرائی ہوئی، علی گڑھ تحریک کے اکابر
نے اردو کے تہی دامن کو موضوعات کے تنوع، خیال کی رنگارنگی اور اپنے
اسالیب کی بوقلمونی سے پُرمایہ بنا دیا۔ ماضی کے ان تمام تموجوں اور تہلکوں
کی پوری داستان اور چھان پھٹک اس کتاب میں آپ کو ملے گی۔

حال میں بہت سے مسائل ہیں جن کا جواب اردو کے تاریخی اور ادبی
پس منظر میں دیا گیا ہے اردو اس ملک کی لنگوا فرینکا ہے وہ ملک کے ایک سرے
سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ہماری گنگا جمنی
تہذیب کی مونھ بولتی تصویریں ہیں۔ ملک کی دیگر زبانوں سے اس کا بہناپا
ہے ہندی اس کی ماں جائی ہے ہندی اردو کے رشتے کے تحت یہ بھی دکھایا
گیا ہے موجودہ اردو رسم خط اردو کے مزاج کے عین مطابق ہے، املا
کی کوتاہیوں کو اردو رسم خط کا نقص بتانا محض مغالطہ ہے۔ حال کے
اس مسئلے کا جو حل پیش کیا گیا ہے وہ طمانیتِ قلب کا سبب بنے گا۔

آزاد ہندوستان میں اب اردو کا مستقبل روشن ہے چالیس سال
کی مسلسل رستخیز بےجا کے بعد نفرت کی دیواریں رفتہ رفتہ بیٹھ رہی
ہیں۔ زبانوں پر تجربے اور انکے تجزیے ہو رہے ہیں۔ افہام و تفہیم کی
راہیں کھل رہی ہیں اب زبان لفظوں کا مجموعۂ پریشان نہ رہ کر آوازوں
کا نظام بن گئی ہے۔ تقابلی یا تاریخی لسانیات کے ذریعے زبانوں کے
باہمی تعلقات کی بازیافت ممکن ہو گئی ہے لسانیات کے جدید اصولوں
کے مطابق "تازہ واردوں" اور "نو ولائتوں" کو "اجنبی" زبان سکھائی

جاتی ہے۔ اعضائے صوت کے تفصیلی مطالعہ سے لسانیات کا یہ
علم تصوراتی یا خیالی نہیں رہتا عملی ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے آخری
جزو میں اسی دلچسپ مطالعہ کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے یہ مختلف موضوعات ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں
ہیں جو باہم دگر یوں مربوط منظم اور مسلسل ہیں کہ ان کے درمیان نہ کوئی دیوار
ہے نہ دراڑ۔ ان میں سے ہر موضوع اپنی ایک انفرادی شان بھی رکھتا ہے
اس کتاب میں ان بکھرے ہوئے جلوؤں کو سمیٹ کر ایک آئینہ خانہ بنانے
کی کوشش کی گئی ہے اس طرح کہ ان کی اپنی جداگانہ حیثیت
برقرار رہے۔ اردو میں ان میں سے ہر موضوع پر ایک سے زیادہ
کتابیں موجود ہیں مگر وہ سب کتابیں کسی ایک یا ان میں سے چند موضوعات
پر محیط ہیں یا ان کی اسیر ہیں ان کا دائرہ ان تمام موضوعات پر محیط
نہیں ہے ـــــ لسانیات کا ایک طالب علم ایک ہی وقت میں
اور یکجا اس لیے جاننا چاہتا ہے کہ یہ تمام موضوعات یا عنوانات
اس کے نصاب میں داخل ہیں۔ نصاب میں رکھنے والوں نے ان عنوانات
کو اس لیے رکھا ہے کہ وہ ایم۔اے اردو کے طلباء سے یہ توقع رکھتے
ہیں کہ وہ زبان کے ایک ایک زیر و بم اور پیچ و خم سے لسانیاتی
طور پر یوں واقف ہوں جیسے کوئی سوختہ سامان سخن جہاں تاب
سے۔ یہ کتاب لسانیات کے ان اساتذہ کے لیے بھی مفید ہوگی جنھوں
نے لسانیات کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا مگر انھیں ایم۔اے اردو

کے طلباء کو لسانیات کا ایک پرچہ پڑھانا پڑتا ہے اور اس کے لیے وہ شب و روز درجنوں کتابوں کے مطالعہ سے اپنے مفیدِ مطلب اجزا چنتے رہتے ہیں۔ اپنے مقصد میں مجھے کہاں تک کامیابی ملی ہے اس کا فیصلہ اربابِ نظر اور ارباب ہی کریں گے مجھے تو میری محنت کا ثمر اسی وقت مل جائے گا جب اس کے کسی بھی جزو سے آپ کو اپنے مطلب کی کوئی چیز مل جائے گی۔

میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ   امیر اللہ خاں شاہین
یکم مارچ ۱۹۷۳ء

دوسرا پیش لفظ

کتاب گزشتہ تین سال سے کم یاب تھی طلباء و اساتذہ کے مسلسل مطالبوں نے آخرش مجبور کر دیا کہ دوسرے تمام تصنیفی و تالیفی امور التوا میں ڈال کر یہ کام از سرِ نو انجام دیا جائے۔ مقامِ شکر یہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کی اغلاط کو حتی الوسع دور کر دیا گیا ہے اور یوں یہ کام زیادہ مفید ہو گیا ہے۔

جون ۱۹۸۳ء

زبان اور زبان کی ابتدا کے نظریے

زبان اظہارِ خیال کا وسیلہ ہوتی ہے خیالات کی ترسیل اشاروں سے بھی ہو سکتی ہے مگر جیسی صحیح ترجمانی زبان کے ذریعے ممکن ہے۔ اشاروں سے ممکن تو ہے محال بھی ہے اور بیان کرنے والے کا کمال بھی! اور ہر شخص باکمال نہیں ہوتا جبکہ زبان ہر شخص بولتا ہے اور اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہر شخص کو ضرورت پیش آتی ہے یہ ترجمانی آمنے سامنے اور رو در رو ہونے پر انسانی جسم کے جس آلے یا عضو سے کی جاتی ہے کام کی اہمیت کے پیشِ نظر اردو میں اس عضو کو بھی زبان کہتے ہیں۔ آنکھوں سے دور ہونے پر یہ ترجمانی تحریری زبان کے ذریعہ ہوتی ہے یہ سوال تو بعد کا ہے کہ تحریری زبان کب وجود میں آئی۔ ظاہر ہے انسانی ترقی کے بعد کے ادوار میں یہ مرحلہ آیا ہوگا۔ پہلا اور بنیادی سوال تو یہ ہے کہ انسان نے کب اور کس طرح بولنا سیکھا۔ اس سلسلے میں لوگوں کے درمیان سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

مذہبی افراد کے نزدیک یہ مسئلہ بالکل آسان ہے۔ ان کے مطابق زبان ایک فطری داعیہ اور ودیعتِ ایزدی ہے۔ انسان میں ابتدائے آفرینش سے یہ صلاحیت اسی طرح موجود رہی ہے جس طرح کانوں کو سننے، آنکھوں کو دیکھنے دماغ کو سوچنے اور دل کو دھڑکنے کی قوت عطا کی گئی ہے۔

ان کے برخلاف عمرانیات و لشریات کے ماہرین کی رائیں اس ضمن میں بالکل مختلف ہیں۔ ماہرین لشریات ابتدائی آدمی کی عمر کا تعین کرنے کی کوشش میں ابھی تک یہ تحقیق کر سکے ہیں کہ آدمی پندرہ سے سترہ لاکھ سال قدیم ہے۔ یہ نتیجہ انھوں نے اس ڈھانچے سے نکالا ہے جو تحقیق کے دوران افریقہ سے ملا اور جو آدمی یا ہن مانس کا ہے۔ ان کے نزدیک ابتدائی ایام میں جب آدمی بالکل وحشی تھا اسے زبان کے استعمال کا شعور نہیں تھا۔ یہ بات اس مفروضے پر مبنی ہے کہ آدمی نے اپنے سفر کا آغاز مکمل تاریکی اور گھور اندھیرے سے کیا ہے وہ رفتہ رفتہ روشنی کی طرف بڑھا، گلہ بانی کاشت کاری اور شکار کی طرف مائل ہوا۔ اس کی ضرورتیں بڑھتی گئیں جنھوں نے اسے اظہارِ خیال کی طرف توجہ دلائی۔ ماہرین لشریات کے مطابق نے قوت گویائی اپنی تہذیبی زندگی کے مرحلے میں حاصل کی ہے اس نظریے کے علاوہ آغازِ نطق کے بارے میں مختلف و متعدد نظریات اور بھی پائے جاتے ہیں جو اس طرح ہیں۔

آدمی کا حیوانوں کی آوازوں سے متاثر ہو کر آوازیں نکالنا۔ اس نظریے کے مطابق آدمی نے حیوانوں کی آوازوں سے آوازیں اخذ کر کے الفاظ کے پیکر تراش لیے مثلاً کُو، کُو، ہنہنانا، غرانا، ممیانا، میاؤں میاؤں وغیرہ آوازوں کے الفاظ لیے گئے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہیں ہوتی حالتِ اضطرار میں نکلنے والے الفاظ سے قوتِ گویائی کا حصول۔ اس نظریے کی رو سے غمی و شادمانی کی حالتوں میں جو الفاظ یا آوازیں بے اختیار نکل

جاتی ہیں ان سے آدمی نے گویائی کی طاقت حاصل کی۔ مشکل یہ ہے کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ مختلف ہیں جو آنی و وقتی جذبات کو ادا کرتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ محنت کش طبقوں کے ذریعہ نکلنے والی آوازیں بھی انسانی نطق کے آغاز میں مددگار ہیں۔ مزدور پیشہ افراد جس طرح آج بھی محنت کے دوران کچھ نعرے بلند کرتے ہیں مثلاً بھاری بھرکم چیزوں کو سرکاتے یا کھسکاتے وقت مزدوروں کا ہیّا ہیّا، یا ہی، شا، دھوبیوں کا چھُو چھُو، ملاحوں کی، ہو ہی ہو، وغیرہ بھی ان الفاظ کو جنم دینے کا باعث بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

غیر ذی روح اشیاء اور ماحول کے شور و شغب کی نقل کو بھی لوگوں نے زبان کے آغاز کا ایک نظریہ بتایا ہے۔ مثلاً کھٹ کھٹ، کھڑکھڑاہٹ، ٹن ٹن، گڑگڑاہٹ، چھل چھل، چھم چھم، چھن چھن وغیرہ۔

کچھ لوگوں کے نزدیک تاریخ کے کسی خاص موڑ پر ایک لسانی گروہ نے مختلف اشیاء کے بارے میں متفقہ طور پر یہ طے کر لیا کہ فلاں فلاں چیز کو فلاں فلاں نام سے ہی پکارا اور پہچانا جائے گا۔ یہ نظریہ توسیع زبان کی تاویل ہے آغاز نطق پر روشنی نہیں ڈالتا۔ کیونکہ ایسی گفتگو آلۂ گفتگو کی ایجاد سے پہلے کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔

جرمنی کے کسی مفکروں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ابتدائی آدمی میں چار پانچ سو ایسے مادے تخلیق کرنے کی صلاحیت تھی جن سے وہ الفاظ پیدا کر لیتا تھا۔ بعد میں یہ صلاحیت معدوم ہو گئی۔ مثلاً انگریزی کا لفظ بارملے

بورن بنا فارسی میں یہ مادّہ بار ہے۔ ہندوستان میں بھار ہے۔ اس
طرح اس ایک مادے میں سابقے اور لاحقے لگا کر انگریزی کے سو
سے زیادہ الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ میکس مولر کے مطابق انگریزی
الفاظ کی اصل کل ایسے چار سو ساٹھ مادّے ہیں۔ قدیم سنسکرت قواعد
نویسوں نے سنسکرت جیسی عظیم زبان کے تمام ذخیرہ الفاظ کو کل
ایک ہزار سات سو چھ مادّوں کی فرعات قرار دیا تھا۔ میکس مولر
کے مطابق اب انھیں اور کم کر کے محض ۵۸۰ پانچ سو اسی تک
محدود کیا جا سکتا ہے اس نظریے کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے
کہ دنیا میں بعض ایسی زبانیں بھی ہیں جن میں مادّے اور مشتقات کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً چینی زبان میں ہر لفظ مطلق اور جامد حیثیت
کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں کسی لفظ سے دوسرا لفظ نہیں بنتا۔

امریکی ماہر لسانیات لیپرسن کے مطابق زبان کی ابتدا خیال کی
ترسیل کے لیے نہیں ہوئی بلکہ جوش اور جذبے کو ہلکا کرنے کے لیے ہوئی
ہے۔ کیونکہ ابتدائی آدمی زیادہ پُر جوش تھا اس لیے جذبات سے
سرشار ہو کر وہ بے معنی آوازیں نکالتا تھا جذبات کے غلبے سے مغلوب ہو کر
وہ ناچتا اور گاتا تھا۔ اس میں بے سُر تال ہوتا تھا۔ کبھی کبھی خوشش
آہنگ بھی ہوتا ہوگا۔ کسی واقعہ سے خوش ہوتا۔ کسی پر غم کھاتا تھا۔
اس کے مونھ سے جو بے محابا فقرے ادا ہوتے تھے بعد کے ادوار میں
انھیں کو اس کے مسلسل ترقی کرتے ہوئے شعور نے اپنی ضرورت کے

مطابق ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا۔ اسی طرح زبان کا آغاز کلمہ کے بجائے
کلام سے ہوا۔ مثلاً کسی شکاری نے شکار مارنے پر خوشی سے
سرشار ہو کر جو نعرہ لگایا مثلاً وہ یہ تھا "ترا را بوم دے"
(TARA RA BOMDAY) اس کے ساتھیوں نے
خوشی میں اس کے شریک ہو کر یہی کلام دہرایا اور وہ ان
سب کا معمول ہو گیا۔

زبان کی ابتدا کے یہ مختلف نظریے ادھوری سچائیوں کے حامل
ہیں۔ ان سب کے بطلان کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے زبان
کے آغاز کے بارے میں مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں مثلاً
ذی روح یا غیر ذی روح اشیا سے ابتدائی آدمی کی اثر پذیری
ایک کھلی ڈلی حقیقت ہے بالکل ممکن ہے کہ اپنے گرد و پیش
کے شور و شغب سے ابتدائی آدمی متاثر ہوا ہو اور اس نے
اپنے تئیں بولنے کی مشق بہم پہنچائی ہو۔ اسی طرح اضطراری حالت
میں نکلنے والے کلمات نے بھی ممکن ہے اسے گویائی کی طرف مائل
کیا ہو۔ یہ مسرت و حیرت کی گھڑیوں کا انعکاس بھی ہو سکتا ہے غمی
اور شادمانی کی حالت کا تقاضا بھی خود اعتمادی کی راہیں کھلی ہوں گی
اتنا تو طے ہی ہے کہ یہ تمام الفاظ آج بھی انسانی زبانوں میں موجود
ہیں۔ رہی یہ بات کہ ابتدائی آدمی زیادہ پُر جوش تھا، جذبات
کے غلبہ کو کم کرنے کے لیے اس کے منھ سے بے ہنگم آوازیں نکلتی تھیں

جو بے معنی ہوتی ہونگی تاہم اس کے جذبات کی تسکین اور تہذیب میں
ایک اہم رول ادا کرتی تھیں۔ ابتدائی انسان کا لہجہ ترنم ریز تھا
یہ بھی اس کے جوش و جذبے اور جذبات کے سبب تھا۔ حادثے
اور واقعے اسی طرح پیش آتے تھے جیسے آج آتے ہیں۔ ان پر غم اور
خوشی کا احساس اور مختلف کیفیتوں سے دوچار ہونا بھی از بس
ضروری تھا اور کیونکہ جذبے کے بہاؤ پر کوئی بند یا روک ٹوک نہیں
اس لیے اسکے بے محابا اظہار کی شروع شروع میں کوئی حد ہی نہ
ہوگی اس لیے ایک ہی سانس میں بجائے اکھڑی اکھڑی باتیں
کہنے کے ایک دم طویل بات کہتا ہوگا جوں جوں تمیز آتی
گئی بات کو تول تول کر کہنے لگا اس طرح پہلی حالت نعرے اور
جملے پیدا کرنے کی ہوئی دوسری صورت ان کے ٹکڑے کرنے یا
مسلسل بات کو مختصر انداز میں کہنے کی ہوئی اس طرح لیپرسن کی
بات کی معقولیت اور معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

رہی میکس مولر اور دوسرے جرمنی مفکروں اور پروفیسروں
کی یہ رائے کہ ابتدائی آدمی میں کچھ مادے تخلیق کرنے کی
صلاحیت تھی جو بعد کے ادوار میں معدوم ہوگئی۔ ہمارے خیال میں
اگر مادے تخلیق کرنے والی صلاحیت آدمی تفصیل میں نہ جائیں
تو محسوس ہوگا، کہ قوت گویائی کی یہ صلاحیت آدمی سے کسی بھی دور میں
معدوم نہیں ہوئی وہ آج بھی موجود ہے اور اسی طرح دیکھی جا سکتی ہے

جس طرح انسان اوّل میں تھی اس کے بعد وہ برابر ترقی کرتی رہی
ابتدائی انسان نے چاہے گلہ بانی کاشت کاری اور شکار کرنا نیز
آگ جلانا بہت بعد میں سیکھا ہو تاہم نطق کی نعمت، قوت گویائی
اور طلاقت لسانی سے وہ پہلے ہی سے بہرہ ور ہے اسی طرح جس
طرح اس کے پاس کان ناک آنکھ تھی۔ باصرہ شامہ اور سامعہ تھی
جس طرح سوچنے والا ذہن اور دھڑکنے والا دل تھا۔ بالکل اسی
طرح اس کے پاس زبان تھی۔ جوش اور جذبہ تھا۔ یہ جذبہ STIMULUS
تھا جسنے اسے لب کشائی کی طرف متوجہ کیا۔ خیال کی ترسیل
ہوگئی۔ یہ عمل جوں کا توں آج بھی موجود ہے شیر خوار بچہ کس طرح
آہستہ آہستہ اپنے ماحول کی زبان سیکھتا ہے۔ ابتدا میں اس کا ذخیرہ
الفاظ کم سے کم ہوتا ہے یہاں تک کہ وہی پروان چڑھ کر اس قابل ہو جاتا
ہے کہ ضخیم لغات کی تدوین کر سکے۔ آج کا ہر شیر خوار آغاز نطق کے اس
نظریے کی زندہ مثال ہے کہ قوت گویائی کی نعمت قدرت کا عطیہ ہے
یہ داعیہ ہر انسان کو ودیعت کر دیا گیا ہے۔ رہی ماہرین بشریات کی تحقیق اس
سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ مفروضوں پر منحصر محققوں کی
نارسائیوں کی شاہد ہے اور جو بتاتی ہے کہ وہ آغاز نطق کے بارے
میں کوئی صحیح رائے قائم کرنے کے بجائے ہڈیوں کے جن ڈھیروں اور
مشکوک ڈھانچوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بہت ممکن ہے کل وہ بھی
غلط ثابت ہو جائیں۔ ویسے ہی جس طرح پہلے جاوا میں پایا گیا انسانی ڈھانچہ

دس لاکھ سال پرانا سمجھا جاتا تھا اپنی قدامت سے اس لیے محروم ہو گیا
کیونکہ افریقہ میں اس سے بھی قدیم ۷۵ سے، ۱۱ لاکھ سال پرانا مشکوک
ڈھانچہ دستیاب ہو گیا۔

اس تمام بحث کا جو نچوڑ سامنے آتا ہے اس کی رو سے یہ بات بآسانی
کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی آدمی جذبات کی پوٹ تھا اس پر جوش و
جذبہ کا عمل دخل تھا اس لیے وہ خود کو ہلکا کرنے کے لیے زبان کھولتا تھا۔
اس کی یہ لب کشائی تلاطم خیز سمندر یا باڑھ پر آئی ہوئی ندی
کی طرح تھی اسی لیے منھ کھولتے ہی جملے کے جملے اور فقرے کے
فقرے نکل جاتے تھے۔

بعد کے ادوار میں جوں جوں اپنے جذبات کی تہذیب و تسکین
کی ان فقروں کو ٹکڑوں یا لفظوں میں تقسیم کرنے پر قادر ہو گیا۔
گویا پہلے جملوں کے ڈھیر تھے۔ بعد میں لفظوں کے مینارے چننے لگا
یہ گویا زبان کی نزاکت کے شعور کا مرحلہ بعد کا ہے۔ پہلے مسالہ مہیا ہوتا
ہے بعد میں اس مسالے کو کھپانے کا مرحلہ آتا ہے۔

ابتدائی آدمی کا لہجہ نرا ترنم ریز تھا۔ وہ بولتا نہیں گاتا تھا
ناچتا تھا شاید چلتا کم تھا تھرکتا زیادہ تھا۔ بالکل ابتدا میں بے معنی
آوازیں نکالتا تھا۔ اس لیے کہ آوازوں کا یہ اخراج جذبہ کو کم کرنے
کے لیے ہوتا تھا۔ خود اظہاری کے لیے نہیں۔
رفتہ رفتہ اس نے آواز کو اشاروں سے زیادہ خود اظہاری کا

موثر ذریعہ پایا۔ اس لیے ان میں معنویت آ گئی، جوں جوں جوش کم ہوا
ترنم بھی کم ہوتا گیا۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ
ساتھ آوازوں میں معنی، معنی میں فرق و تخصیص امتیاز، اور نزاکت
یہاں تک ہونے لگی، ابتدائی آدمی کی ساری کی ساری ذرّیت
زمین کے کسی ایک خطے میں رہتی ہوگی اس لیے شروع شروع میں ان
سب کی ایک ہی زبان ہوگی۔ بعد میں جغرافیائی حد
بندیوں نے تاریخی حادثات و واقعات نے سماجی جکڑ بندیوں
اور سیاسی حالات نے جو ابتری پیدا کی اس کی ایک بہت بڑی وجہ
یہ بھی ہوئی کہ ان میں ان کے لب و لہجہ کے مطابق زبانیں بٹ گئیں
اور بدل گئیں۔

آج دنیا میں زبانوں کے متعدد خاندان پائے جاتے ہیں۔ بہت ممکن
ہے کہ کل کوئی ولیم جونس اٹھ کر یہ ثابت کر دے کہ دنیا بھر کی زبانوں
کا یہ کنبہ کسی ایک مورث اعلیٰ اور جدِّ امجد کی اولاد ہے۔ اس تفصیلی
گفتگو سے زبان کی جو شکل بنتی اور اس کی جو ہیئت قرار پاتی ہے اس کے مطابق زبان
الفاظ کا مجموعہ پریشان نہیں وہ اک نظام اصوات ہے اس نظام کی تشکیل
یا زبان کی صورت گری اس طرح ہوتی ہے کہ زبان جملوں یا عبارتوں سے
عبارتیں الفاظ سے الفاظ اور اصوات یا آوازوں سے بنتے ہیں زبانوں
کی تشکیل میں آوازوں کو جو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ کچھ اس
بات سے ہو سکتا ہے کہ کسی بھی زبان کے تقریباً دس فی صد الفاظ پر سر برس میں

متروک ہو جاتے ہیں جبکہ صوتیاتی ڈھانچہ صدیوں تک جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔

علم صوتیات (PHILOLOGY) علم لسانیات (LINGIAISTICXE) کی ایک شاخ ہے۔ صوتیات میں بنیادی حیثیت تحریری زبان کے بجائے بول چال کی زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس مطالعہ کا سارا زور الفاظ کے بجائے اصوات پر ہوتا ہے۔ یہ آوازیں نرم و گرم، سخت و شیریں، گرجدار و دھیمی ہو سکتی ہیں۔ یہ دندان شکن بھی ہو سکتی ہیں اور ضیافت طبع کا باعث بھی۔ یہ خارشگاف بھی ہو سکتی ہیں اور دلدیلی بھی۔ علم صوتیات میں گفتگو کو زیادہ سائنسی اور حقیقی بنانے کے لیے ذوق وجدان کو رہنما بنانے کے بجائے سمعی لسانیات (ACUSTIC LINGUTVC) کے اصولوں پر آوازوں کو ایسے آلات سے جانچا جاتا ہے جو آوازوں کا صحیح اور بے لاگ تجزیہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ اعضائے صوت کو بنیاد بنا کر جو صوتیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے وہ زیادہ حقیقی بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ یہاں صوتیات کے اصولوں کو برتا گیا ہے۔

عالمی زبانوں کے خاندان

تقابلی یا تاریخی لسانیات نے دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں کو چند خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ عالمی زبانوں کے اس کنبہ کی درجہ بندی سب سے پہلے اس طرح کی گئی۔

۱۔ ہندیورپی، یا انڈو یورپی، یا انڈو جرمانک
۲۔ سامی، یا سیمٹک
۳۔ فنو یوگرک

ان تین بڑے خاندانوں میں فنو یوگرک خاندان کا نہ تو علاقہ زیادہ وسیع ہے اور نہ ہی اس سے متعلق زبانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس خاندان سے متعلق زبانیں یوروپ کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہیں۔ فنش، ہنگرین، الیتھونین اور سوویت دیس کی کئی زبانیں اس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ساموید زبانیں اسی خاندان کی زبانوں سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں اسی لیے فنو یوگرک اور ساموییدک خاندانوں کو ایک مشترکہ نام یورالک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

ہندیورپی اور سامی خاندانوں کی زبانوں میں بہت قدیم تحریری نمونے موجود ہیں۔ سامی گروہ کی بہت سی زبانیں آج مردہ ہو چکی ہیں عبرانی یا عبریہ

زبانوں کا شمار انھیں مردہ زبانوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ آج اسرائیل کی نئی مملکت کے ذریعہ اس کی نشاۃ الثانیہ تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ اس خاندان کی دوسری اہم زبانیں عربی اور حبشی ہیں ان کے علاوہ ایک اور بڑا عالمی خاندان حامی یا حیمٹیک ہے اس خاندان کی زبانیں بڑی مشابہت رکھتی ہیں۔ حامی زبانوں کا وہ قدیم خاندان ہے۔ جس میں قدیم مصری، قبطی یعنی کوپٹک اور بربری قبائل کی بربیو زبان قابلِ ذکر ہے۔

ہندیورپی کو انڈو ہٹائٹ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ویریں کی جو دستاویز ہاتھ لگی ہے وہ ہٹائٹ زبان کا نمونہ ہے یوں تو تقریباً ۳ ہزار سال کی پرانی تاریخ سامنے آچکی ہے۔ آج اس خاندان کی کئی زبانیں مردہ ہو چکی ہیں اسکے باوجود اس کی بے شمار زبانیں آج بھی موجود ہیں اور متواتر اپنی ترقی میں کوشاں ہیں ہندیورپی خاندان کی زبانوں کو مندرجہ ذیل گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ آرمینی۔ دو ہزار سال قبل مسیح

۲۔ ہند ایرانی۔ دو ہزار سال قبل مسیح (قدیم و جدید فارسی) افغانستان اور کچھ روسی زبانیں۔

۳۔ ہند آریائی ۔ ۱۵۰۰ قبل مسیح، سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش مشرقی اور مغربی ہندی نیز تمام جدید آریائی زبانیں۔

عہدِ حاضر میں لسانیات کے مطالعہ کے لیے خاص طور سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ عمومی یا جنرل لسانیات

۲۔ تاریخی یا تقابلی یعنی ہسٹوریکل اور کمپیریٹو لسانیات

۳۔ انطباقی یا عملی یا اپلائڈ لسانیات

۴۔ ہیلنی یا ہیلنک ۔ ۲۲۰۰ ق م۔ اس میں صرف یونانی زبان کو شامل کیا جاتا ہے۔ جو آج بھی یونان میں رائج ہے۔

۵۔ اطالوی یا اٹیلک ۔ آج کی لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، اسپینی اور پرتگالی اسی گروہ میں شامل ہیں۔

۶۔ کیلٹک :۔ اس گروہ کی زندہ زبانیں آئرش، ویلش اور برٹین ہیں۔

۷۔ جرمنی یا جرمینک :۔ اس کی ایک شاخ گوتھک تھی جو اب مردہ ہو چکی ہے اسی گروہ کی دو شاخیں اسکینڈینیوین اور مغربی جرمینک ہیں۔ مغربی جرمینک میں جرمن، ڈچ اور انگریزی زبانیں ہیں اور اسکینڈینیوین میں آئس لینڈک نوروینجین، سویڈش اور ڈینش زبانیں شامل کی جاتی ہیں۔

۸۔ بالٹوسلاوک :۔ عیسوی سن کے آغاز میں ہی غالباً بالٹک زبان سلاوک سے علیحدہ ہو گئی۔ بالٹک شاخ کی لتھوآنین اور لیٹوین زبانیں آج بھی موجود ہیں۔ سلاوک گروہ کا دائرہ خاصہ وسیع ہے۔ اس کو تین حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

ا۔ جنوبی سلاوک :۔ اس حصے میں سیکڈونین، بلگارین، سارلو، کروٹین اور سولوں زبانیں شامل ہیں۔

ب۔ مغربی سلاوک :۔ اس میں پولش، سلواک، زیکیہ زبانیں شامل ہیں۔

ج۔ مشرقی سلاوک :۔ یہ یوکرینش اور روسی زبانوں پر مشتمل ہے۔

۹۔ الیرین :۔ اس گروہ کی زبانیں ہلینک کے ساتھ بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔ البانی زبانوں کو اسی کی جدید شکل خیال کیا جاتا ہے۔

زبانوں کے ان تین اہم اور عظیم خاندانوں کے علاوہ دنیا بھر میں جو دوسری زبانیں بولی برتی جاتی ہیں ان کے چند اہم ترین خاندان مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ترکی یا ٹرکش :۔ اس میں ترکی اور ازبک زبانیں شامل ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترکی کا تعلق بعض دوسری زبانوں کے وسیلے سے اطالک خاندان سے ہے۔ ہرچند کہ ابھی تک اس خیال کی کہیں سے کوئی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔

۲۔ اطالک :۔ اس خاندان کی بڑی اور مشہور شاخوں میں منگولین اور وہ تنگوسک زبانیں شامل ہیں جن کی بڑی مشہور شاخیں منچو اور شمالی مشرقی ایشیا میں بولی جانے والی کئی دوسری اہم زبانیں شامل ہیں۔ جاپانی اور کوزین بھی اسی خاندان کی زبانیں ہیں۔

۳۔ کاکیشین :۔ اس خاندان میں کاکیشین، جارجین اور کئی دوسری زبانیں شامل ہیں۔

۴۔ دراویدی یا ڈریویڈین زبانوں کا خاندان :۔ زبانوں کا یہ خاندان جو جنوبی ہندوستان میں آج بھی موجود ہے۔ عالمی زبانوں کے خاندانوں میں اہم ترین خاندان ہے۔ ہندستان جیسے

عظیم ملک (باعتبار آبادی اور باعتبار رقبہ دونوں) کی ایک تہائی آبادی آج بھی اسی خاندان کی چار اہم زبانیں بولتی ہیں یعنی تامل، تلگو، کنڑ اور ملیالم۔ ان کے علاوہ تریہی وغیرہ اسی خاندان کی کچھ اہم زبانیں آج بھی رائج ہیں۔

۵۔ آسٹرک خاندان :۔ اس خاندان کی کول منڈا اور مون کھمیر زبانیں ہیں ان کا حلقۂ اثر مشرق اور جنوب مشرق کی جانب پھیلا ہوا ہے شمالی اور مشرقی ہندوستان میں اس خاندان کی زبانیں مروج ہیں۔ کمبوڈیا کی زبان بھی مون کھمیر خاندان میں شامل ہے۔

۶۔ انڈمانی یا انڈمانیز :۔ جزائر انڈمان میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا کوئی تعلق ابھی تک کسی اور زبان سے قائم نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان جزائر کے الگ الگ پڑے رہنے اور ان کے باشندوں کی پسماندگی و قدامت کے پیش نظر یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہاں کی زبان اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اسی لیے اسے ایک مستقل خاندان خیال کیا جاتا ہے۔

۷۔ چینی تبتی یا سائنو تبتین :۔ اس خاندان میں مندرجہ ذیل گروہ شامل کیے جاتے ہیں۔

۲ الف :۔ تبتی برمی یا تبتو برمیز :۔ اس میں چینی اور برمی دونوں زبانیں شامل ہیں۔

ب :۔ چینی زبانیں :۔ چین میں بولی جانے والی متعدد زبانیں

اسی خاندان کی ہیں۔

ج :۔ کھتائی :۔ اس میں سیامیز، لوطیش اور کچھ دوسری زبانیں شامل ہیں۔

د :۔ ویتنامی :۔ یہ بھی تعریفی اعتبار سے اس خاندان کی زبان کہی جاتی ہے اگرچہ کہ یہ رشتہ ابھی تک پوری طرح ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔

۸۔ ملایا اور پولینشیائی :۔ اس خاندان میں متعدد گروہ شامل ہیں مثلاً

(۱) ملائی یا ملائیشین :۔ اس میں انڈونیشین، مالے اور انڈونیشیا کی دیگر بے شمار زبانیں یعنی بالی اور جاوانی وغیرہ شامل کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ فلپائنز کی جملہ زبانیں بھی اس گروہ میں شامل کی جاتی ہیں۔

(۲) ملیشیائی یا ملیشین :۔ اسی گروہ کی وہ زبانیں ہیں جو جزائر سلومن اور اسی خطے کے دوسرے جزیروں میں رائج ہیں۔

(۳) مائکرونیشیائی یا مائکرونیشین :۔ اس گروہ میں جزیرہ گلبرٹ کی زبانیں شامل کی جاتی ہیں۔

(۴) پولینشیائی :۔ اس میں فیجی اور ہوائی سی سی مشہور زبانوں کے علاوہ جزیرہ البرٹ اور دوسرے کئی جزیروں کی زبانیں شامل ہیں۔

۹۔ نیوگنی یا نیوگنین :۔ نیوگنی میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ابھی تک

یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے کہ کسی دوسرے خاندان سے ان کا کوئی تعلق ہے کہ نہیں۔

۱۰۔ آسٹریلیائی یا آسٹریلین :۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے مختلف زبانیں بولتے ہیں ان میں شمالی زبان کے علاوہ باقی ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

۱۱۔ شمالی امریکہ کی زبانیں :۔ شمالی امریکہ میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب کو تقریباً ۵۵ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض ماہرین نے ان خاندانوں میں سے بعض کو یکجا کر دیا ہے اور یوں ان کی تعداد گھٹا دی ہے بعض اہم خاندان حسب ذیل ہیں۔

الف :۔ اسکیموئی یا اسکیموین :۔ اس خاندان میں اسکیمو اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ موجود ہے۔

ب :۔ انگونکیائی :۔ اسی میں شمالی مشرقی اور وسط مغربی امریکہ کے تعلیم یافتہ باشندوں کی زبانیں شامل ہیں ان کا حلقۂ اثر دور مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔

ج :۔ ژوکتن :۔ اس خاندان میں نکنا اور کواکیت زبانیں شامل ہیں۔ بعض لوگ ان کو انگونکیائی خاندان سے متعلق کرتے آئے ہیں۔

د :۔ جیہان :۔ گوٹے اور کولمبیا کے درمیان یہی خاندان

پھیلا ہوا ہے۔

۱۲۔ جنوبی امریکہ کی زبانیں:۔ جنوبی امریکہ میں بہت سی ریڈ انڈین زبانیں رائج ہیں۔ جن میں سے کچھ اب بھی جوں کی توں برقرار ہیں ان میں خاص خاص خاندان اراونکن، کارِبین ٹوپی گوآرین اور آرین کیبین ہیں۔ ان میں سے ابھی تک بہت سی زبانوں کی گروہ بندی ہونا باقی ہے جوں جوں اس کا تقابلی مطالعہ ہوگا حقیقتِ حال واشگاف ہوتی جائے گی۔

عالمی زبانوں کے خاندانوں کے اس مطالعہ میں ایسی بہت سی زبانیں ہیں جو اس مطالعہ میں نہیں آسکی ہیں۔ خاص طور سے افریقہ کے براعظم کی بہت سی زبانیں ابھی تک تحقیق کی دسترس سے باہر ہیں۔ ماہرینِ لسانیات ان کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ اور ایک زبان کا دوسری زبان سے موازنہ یہ ثابت کردے گا وہ اپنی اصل میں کس خاندان کی زبانیں ہیں۔ اس لیے آج بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقابلی لسانیات ماہرین لسانیات کے ہاتھ میں ایک ایسا کارگر حربہ ہے جو دنیا بھر کی عام زبانوں کے رشتے ناتوں کی بازآفرینی میں بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔

قدیم ہند یورپی زبان

ہند یورپی زبان کی بازیافت محققین کا کارنامہ ہے۔ تمام دنیا میں بولی جانیوالی آٹھ نو سو بڑی بڑی زبانوں کی اصل زبانوں کے چند بڑے خاندان بنائے جاتے ہیں۔ زبانوں کا ہند یورپی خاندان جسے اندو ہٹاٹ اور انڈو یورپی بھی کہا گیا ہے۔ ان میں اہم ترین خاندان ہے، یہ اپنی قدامت کے اعتبار سے بھی اور اپنی وسعت کے سبب بھی اپنا ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ دنیا کی تقریباً ساری ہی مشہور زبانیں جیسے لاطینی (لیٹین) یونانی (گریک) گوتھک، جرمنی، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، سویڈش، ڈینش، روسی ڈچ، ناروےجی، انگریزی اسی خاندان کی زبانیں ہیں ان کے علاوہ ہند ایرانی خاندان کی مختلف زبانیں قدیم و جدید فارسی اور ہند آریائی زبانیں جن میں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سب شامل ہیں اور ان سے پیدا ہونے والی تمام علاقائی بولیاں آسامی، بنگالی، اڑیا، مرہٹی، پنجابی، گجراتی راجستھانی، مشرقی اور مغربی ہندی کی بولیاں جن سے اردو اور ہندی نکلیں سب اسی خاندان کی مختلف شاخیں اس کے ارتقا کی مختلف تشکلیں اور اس کے عروج و زوال کی داستانیں ہیں قدیم ہند یورپی کی یہ مختلف اور پھیلی ہوئی شکلیں اس بات کی غماز ہیں کہ یہ خاندان جمود و تعطل کا شکار نہیں ہوا

بلکہ اپنی پارہ صفتی اور سیماب وشی کے سبب پھلتا پھولتا اور پھیلتا ہی رہا۔

ہند یوروپی دراصل ان آریوں کی زبان تھی جنھوں نے اپنے مسکن دیرینہ کو تج اور تیاگ کر اس طور پر کوچ کا بگل بجایا کہ ان کا ایک حصہ یوروپ کی طرف رومانیہ، بلغاریہ ہوتا ہوا یونان جا نکلا اور وہاں عظیم یونانی تہذیب کا بانی مبانی بنا۔ اس مغربی شاخ کو ہیلن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

انھیں کا دوسرا حصہ ایشیائی ملکوں کی طرف نکل گیا۔ آریوں کی اس شاخ کو ہتا ئٹ کہا جاتا ہے ابھی بیسویں صدی میں ہتا ئٹ کی جو دستاویز ملی ہے وہ ہند یوروپی زبان کی پہلی کڑی کہی جاتی ہے اس زبان کا تجزیہ بتاتا ہے۔ کہ اسکی ساخت یک رکنی تھی۔ اس دستاویز میں اس کے دیوی دیوتاؤں کے جو نام درج ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو اس دستاویز کے بعد لکھی گئی۔ آریوں کی اس تصنیف رگ وید میں نظر آتے ہیں جو اس کے کئی ہزار سال بعد آریوں کے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد لکھی گئی۔ مثلاً ان دارا ام ت ارا۔ وغیرہ۔

آریوں کے قدیم مسکن کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے گرچی کے مطابق آریہ ایشیائے کوچک کے باشندہ ہوں گے۔ ایشیائے کوچک میں ہتا ئٹ کی دستاویز سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے ۳ ہزار سال قبل مسیح میں انھیں میسوپوٹامیہ میں بھی دیکھا گیا ہے۔ میکس مولر کے مطابق یہ وسطی ایشیا کے باشندہ رہے ہوں گے۔ بعض نے یوروپ میں ان کے مسکن کی تلاش کی ہے یوں اب اس بات کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ کہ وہ یورال کے کوہستانی سلسلے سے لے کر

بحر کیسپین کے سواحل تک کے اسی علاقے میں پھیلے ہوئے تھے جو ایشیا اور یوروپ کے درمیان مشترک خطہ ہے اور وہیں سے ان کی دونوں شاخوں نے دو جداگانہ سمتیں کسی نامعلوم وجہ سے اختیار کیں۔ ان کی نقل مکانی کا سبب آفات ارضی و سماوی بھی ہو سکتا ہے، نئی چراگاہوں کی تلاش بھی اور ان کی وہ تجسس پسندی ہی جس میں آرام طلبی کے بجائے مشکل پسندی اور سخت کوشی کے عوامل کار فرما رہے ہوں گے۔ یہ قدیم آریہ مختلف و متضاد حالات میں خود کو ڈھالنے کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے۔ عقیدے کے اعتبار سے ان کی تہذیب پدرانہ تھی۔ ان کے دیوتاؤں میں آکاش اوشا یا شفق، سوریہ یا پتا یا پرڑا اور ماتا یا میر کے نام ملتے ہیں۔ جہاں تک ان کی کاروبارانہ زندگی اور پیشہ ورانہ دلچسپی کا تعلق ہے۔ یہ لوگ صحرائی گلہ بان تھے اس سمندر کا کوئی لفظ ان کی (قدیم) زبان میں نہیں پایا جاتا۔

دراصل الفاظ کا ذخیرہ یا لفظیات (ووکیبلری) ہی وہ وسیلہ ہوتا ہے جس سے قومیں اپنی مسکن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خود ویرس یا ویریہ کی کھوج سے ہی لوگوں کا دھیان اس طرف گیا۔ کہ دنیا کی کئی اہم زبانیں کسی ایک ہی بڑے خانوادے سے متعلق ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ولیم جونس نے پہلی مرتبہ اس طرف اشارہ کیا۔ کہ لیٹن، گریک اور گوتھک کسی ایک ہی بڑے خاندان کی مختلف شاخیں ہیں (واضح رہے اس سے قبل اردو کے پہلے ماہر لسانیات خان آرزو نے بھی فارسی سنسکرت کے کسی ایک اصل سے ہونے کا اشارہ کیا تھا) چنانچہ مزید تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ قدیم ہند یوروپی بولنے والے ویرس کہلاتے تھے وہاں ویرس کے معنی مرد کے تھے) اسی سے سنسکرت ویریا طالوی VIR

اور جرمنی WER نکلے۔ اس ذیل میں مزید روشنی نہیں پڑتی تاہم اتنا طے ہے
کہ ایرانیوں اور ہندوستان کے آریاؤں کے پیش رو یہی آریہ تھے جنکی تہذیب
آشوریوں اور مصریوں کے بعد معرض وجود میں آئی تھی۔

تاہم جب یہ قدیم ہند آریائی زبان اور اس کی تہذیب وجود میں آئی
تو اس نے لسانی خزانے میں زبردست اضافے کیے یہی وہ لوگ تھے جو دامن
یورال سے نکل کر ایشیا اور یورپ کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور انھیں کے
ذریعہ بڑی بڑی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ ایران میں یہ ازرتشتی مذہب کی بنا رکھنے
والے بنے۔ ہند ایرانی زبانیں انھیں کے ذریعہ وجود میں آئیں۔ ایران کی پہلوی
اوستا زبانیں اسی کی شاخیں ہیں۔ ہندوستان میں ہند آریائی خاندان کی
بنیاد بھی انھیں کے ذریعہ پڑی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ
جب یہ W/ROS جو قدیم ہند آریائی زبان بولنے والے لوگ تھے ایران
کے خطوں میں داخل ہوئے تو جو زبان انھوں نے ایران میں داخل ہونے کے بعد
بولی اسے ماہرین ہند ایرانی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایران میں
رہنے والے ان آریوں نے داخلہ ایران کے تقریباً پانچ سو سال بعد جب
ہندوستان کا رخ کیا اور ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد جو زبان بولی وہ
ہند آریائی زبان کہلاتی ہے۔ جس کا پہلا دور ویدک کال کے نام سے موسوم کیا
جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ پورے ملک میں پھیلتے گئے اسی لیے ویدک کال کی زبان
بھی مختلف معیاروں میں ڈھلنے لگی۔ اس قدیم ہند یوروپی زبان کی کچھ اپنی خصوصیات
تھیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں کے لیے کسی ایک ہی اصل سے ہونے کا اشارہ پہلے پہل

ایک ہندوستانی (ولیم جونس) نے کیا تھا۔ اس لیے تحقیق میں کامیابی کے بعد
علما لسان نے آریاؤں کی قدیم زبان کا نام ہی ہند یوروپی رکھا۔ اسی
طرح ایرانی قدیم اور ہندوستان کی آریائی شاخوں کو ہند ایرانی اور
ہند آریائی کے نام سے یاد کیا گیا۔

قدیم ہند یوروپی کے سلسلے میں مزید معلومات کرنے کے لیے نیز اسکی
تفصیلی خصوصیات جاننے کے لیے گزشتہ چار صدیوں سے ماہرین سخت جدوجہد
کر رہے ہیں اب تک ان کی تحقیق کے جو نتائج برآمد ہو سکے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ ویرس کے پاس ذخیرۂ الفاظ بہت کم تھا۔
۲۔ ویرس کو بندشی آوازیں (STOP) بہت مرغوب تھیں۔
۳۔ نفسی آوازوں کا استعمال بہت کم تھا۔
۴۔ ہکار آوازیں موجود تھیں۔
۵۔ حلقی آوازیں بھی ذرا سی بدلی ہوئی شکل کے ساتھ موجود تھیں۔
۶۔ حرف (نیں) کا استعمال ہوتا تھا یہی (ز) کا کام بھی کرتا تھا۔
۷۔ پہلوئی آوازوں میں حرف "ل" کی ایک شکل تھی "ل" کی ثانوی آوازیں نہ تھیں۔
۸۔ حرف "ر" کی ایک شکل بھی ثانوی آوازیں اس کی بھی موجود نہیں تھیں۔
۹۔ خ، غ، ت، ز اور "ژ" استعمال ہوتی تھیں۔

آریہ جب مختلف ملکوں میں گئے تو ان کی زبان بھی بہت متاثر ہوئی کچھ آوازیں

ان کے ذخیرے سے نکل گئیں جب کہ معکوسی آوازیں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ
ڑ، ڑھ وغیرہ شامل ہوگئیں۔
مندرجہ ذیل نقشے سے آوازوں کے اس نظام کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۱	لبی آوازیں	پ، پھ	ب، بھ	م
۲	دندانی آوازیں	ت، تھ	د، دھ	ن
۳	غشائی آوازیں	ک، کھ	گ، گھ	ن
۴	حلقی آوازیں	ق، قھ	گ، گھ	
۵	حلقی لبی آوازیں	قو، قھو	گو، گھو	

مذکورہ آوازیں اعضائے صوت کی مناسبت سے نامزد کی گئی ہیں
اعضائے صوت کے اعتبار سے اصوات کی اس درجہ بندی کی تفصیل
اس کے مقام پر ایک الگ باب کے تحت درج کی گئی ہے۔

— ۔ —

ہندوستان میں زبانوں کے خاندان

آریوں سے پہلے :- ہندوستان میں آریہ نسل سے پہلے کون کون سی قومیں ہو گزری تھیں اور وہ کون کون سی زبانیں بولتی تھیں۔ اس کا تذکرہ بہت کم کتابوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چرجی نے بہت احتیاط کے ساتھ ان بیانات کو بنیاد بنا کر جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کی رو سے ہندوستان میں پایا جانے والا انسانی گروہ حبشی (NEGROTOS) کہلاتا ہے۔ یہ لوگ شاید افریقہ سے سمندر کے کنارے کنارے چل کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ابتدائی تہذیب کے زمانے کے لوگ زراعت یا غلہ بانی سے نا آشنائے محض تھے۔ پہلے یہ جنوبی ہند میں پھیلے اس کے بعد شمالی ہند سے ہوتے ہوئے برما گئے اور وہاں سے انڈونیشیا کے جزیروں میں جا بسے۔ ملایا، سماترا، اور فلپائن کے بعض جزیروں میں آج بھی ان کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ جنوبی بلوچستان اور مشرقی برمی علاقوں کے بعض ساحل میں آج بھی ان کی کچھ نشانیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کے لسانی سرمائے میں کہیں کہیں ان کا وجود تقریباً نا کے برابر ہے۔

زبانوں کا آسٹرک خاندان :- ہندوستان میں آنے کا سراغ جس دوسری نسل میں ملتا ہے وہ لوگ آسٹرک ہیں ان کے نام کی مناسبت سے وہ زبان جسے وہ استعمال کرتے تھے آسٹرک

زبان کے نام سے موسوم ہے انھیں آسٹرک (AUSTRIC) یا پروٹو آسٹرولائڈ بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بسنے کے بعد ان کی کچھ شاخیں ملایا، انڈونیشیا وغیرہ پہنچیں، ہند چینی اور ہمالیہ میں زبانوں کے اسی خاندان کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ نکوباری اور سیلون کے وِڈا اسی خاندان سے متعلق رہے ہیں۔ ہندوستان میں آج بھی کول اور منڈا زبانیں جو اسی خاندان کی ہیں بولی جاتی ہیں۔ آسٹرک قبائل آریوں سے پہلے دراوڑوں کے ساتھ ترقی کر رہے تھے۔ انھوں نے دراوڑوں اور بعد میں آنے والے آریوں کو تہذیبی طور پر بہت متاثر کیا تناسخ کا عقیدہ آریوں کو انھیں کی دین ہے۔ دریائے گنگا کا یہ نام بھی آسٹرک کا عطیہ ہے۔ آسام، بنگال، بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے بعض حصوں میں وہ قبائل آج بھی موجود ہیں جو آسٹرک خاندان کی بولیاں آج بھی بولتے ہیں۔

زبانوں کا دراویڈی خاندان:۔ ہندوستان میں بولے جانے والی زبانوں کا تیسرا اہم خاندان دراویڈی خاندان کہلاتا ہے۔ یہ ان دراوڑوں کی زبانوں کا خاندان ہے جو آسٹرک نسل کے فوراً بعد تقریباً اسی عہد میں ہندوستان میں موجود تھے جس میں آسٹرک خاندان اپنی ترقی کے اعلیٰ منازل کو چھو رہا تھا۔ یہ لوگ بحیرۂ روم ہی کی طرف سے آئے، شروع میں وادیٔ سندھ میں جا بسے۔ پھر آہستہ آہستہ ملک کے شمالی حصوں میں پھیل گئے۔ آریوں کی یورش و یلغار کے بعد جنوب کی طرف رُخ کیا اور تب سے اب تک جنوبی ہند میں اپنی زبانوں کی الگ شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی تقریباً ایک تہائی آبادی دراوڑ زبان کی مختلف شاخیں اور لہجے جانتی

کا وہ علاقہ جہاں براہوی زبان بولی جاتی ہے اس خاندان کے زیر اثر ہے اس خاندان کی چار بڑی زبانیں تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑ ہندوستان کی قومی زبانوں میں شامل ہیں سنسکرت سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ دراوڑ زبان جن میں تامل سب سے قدیم اور سنسکرت کی طرح مالا مال ہے۔ دراوڑی خاندان نے خود سنسکرت اور اس کے وسیلے سے ہند آریائی خاندان کو بہت متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ٹ، ڑ، ڈ کی معکوسی آوازیں ہند آریائی میں دراویڈی خاندان سے ہی لی گئی ہیں۔

زبانوں کا تبتی برمی خاندان:۔ واضح رہے کہ ہندوستان کے کسی علاقے میں بھی چینی زبان نہیں بولی جاتی۔ جو زبانیں تبت و برما میں بولی جاتی ہیں تقریباً وہ اسی خاندان کی زبانیں ہیں جو ہندوستان میں بولی جاتی اور ہمالیائی کہلاتی ہیں یہی زبان سکم اور بھوٹان کے علاوہ مغرب میں لداخ اور مشرق میں ناگا پہاڑیوں میں بولی جاتی ہے۔ زبانوں کا یہ خاندان تبتی برمی کہلاتا ہے یہ دراصل ان چند تبتی چینی اور منگولی قبائل کے ہندوستان میں آنے کے سبب اپنے کچھ اثرات چھوڑ گیا جو ہندوستان کی شمالی مشرقی سرحد سے داخل ہوئے مگر ملک کے دوسرے حصوں میں نہ پھیل سکے۔ اس لیے ان سے لسانی سرمائے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

زبانوں کا ہند آریائی خاندان:۔ ہندوستان میں زبانوں کا سب سے اہم خاندان ہند آریائی کے نام سے موسوم ہے زبانوں کا یہ خاندان اس وقت سے شروع ہوتا ہے

جب سے آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یہاں آنے سے پہلے تک وہ جو زبان بولتے تھے وہ اپنے پہلے مرحلے میں ہند یوروپی کہلاتی ہے اور دوسرے مرحلے میں ہند ایرانی کہلاتی ہے۔ پہلے اور دوسرے مرحلے سے مراد ہے کہ آریہ ہندوستان میں آنے سے پہلے ایران جانے تک یورال کے کوہستانی سلسلے سے بحیرۂ کیسپین کے اس خطے میں جو وادی ڈینیوب تک پھیلا ہوا تھا اور جو یوروپ اور ایشیا میں مشترک ہے وہیں رہتے تھے اسی مشترک خطے کو آریوں کا اصل وطن بتایا گیا ہے۔ انڈو یوروپین زبانوں کی بازیافت سے بھی ان کا اصل وطن یہی مشترک خطہ قرار پاتا ہے جو یوروپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہے جب تک وہ اس خطے میں رہے وہ زبان بولتے رہے جسے ماہر لسانیات ہند یوروپی یا انڈو ہٹائٹ کہتے ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں ان کے کچھ گروہ ایران میں داخل ہوگئے یہی ان کا دوسرا مرحلہ تھا۔ ایران میں داخلے کے تقریباً پانچ سو سال بعد لگ بھگ پندرہ سو سال قبل مسیح میں ان کے گروہ شمال مغرب کی جانب سے ہندوستان میں ہند ایرانی خاندان کی زبانیں بولتے ہوئے داخل ہوئے۔ یہ قبائل کئی سو سال تک متواتر آتے رہے حتیٰ کہ اس منزل میں داخل ہوگئے جسے ہند آریائی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان کا مقابلہ دراوڑ بولیوں سے ہوا۔ آویزش کے ساتھ ساتھ آمیزش بھی ہوئی۔ دراوڑی شاید ان کی طرح فنونِ جنگ سے واقف نہ تھے اس لیے پسپا ہوکر جنوبی ہندوستان میں چلے گئے۔ آریہ نسل کے لوگ شمالی ہندوستان میں پھیل گئے اور یہیں ان کی زبان پھلنے پھولنے لگی۔ علماء لسان نے اس زبان کی ترقی کے تین مدارج بتلائے ہیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ قدیم ہند آریائی (۱۵۰۰) ق م سے (۶۰۰) سال ق م تک

۲۔ وسطی ہند آریائی (۶۰۰) ق م سے (۱۰۰۰ء) تک

۳۔ جدید ہند آریائی (۱۰۰۰ء) سے حال تک

قدیم ہند آریائی کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پانچ منزلوں میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہے۔

(الف) ویدک منزل (رگ، یجر، اتھر، سام) جس میں وید لکھے جاتے ہیں یعنی سنسکرت مذہب کی بانی ہوتی ہے۔

(ب) عہد پانی کی منزل:۔ پانی کی اشٹ ادھیائے اور پتن جلی کی مہا بھاشیہ لکھی جاتی ہیں۔ اس طرح اس دور میں سنسکرت عالموں کی زبان بن جاتی ہے۔

(ج) رزمیہ منزل:۔ سنسکرت سرکاری زبان بن جاتی ہے اس کا تعلق مذہب سے ٹوٹ جاتا ہے۔

(د) ٹکسالی منزل:۔ اس عہد میں سنسکرت قواعد نویسوں کی پابند ہوکر خود کو محدود محصور کر لیتی ہے۔ شدھی کے چکر میں پھنس کر عوام سے دور ہو جاتی ہے اس لیے اس کے پہلو بہ پہلو عوامی بولیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں سنسکرت اپنے پہلے مرحلے یعنی قدیم ہند آریائی کے دور میں ہی تین مختلف معیاروں کی بتائی جاتی رہی ہے۔

(الف) اُدیچیہ یا معیاری سنسکرت:۔ جو ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی حصے میں بولی جاتی تھی۔ یعنی پنجاب اور اس سے ملحقہ علاقوں میں

بولی جانے والی سنسکرت سب سے معیاری سمجھی جاتی تھی۔

(ب) مدھیہ دیشیہ یا وسطی یا نیم معیاری:۔ اس میں مشرقی پنجاب سے الہ آباد تک کا علاقہ شامل تھا یہاں کے لوگوں کی سنسکرت نیم معیاری قرار دی گئی تھی۔

(ج) پراچیہ یا مشرقی یا غیر معیاری:۔ اس میں یو۔پی اور بہار کے علاقے شامل تھے یہ زبان کیونکہ اپنے اصل مرکز سے بہت دور تھی دربار اور سرکار کی سرپرستی بھی اسے حاصل نہ تھی۔ اس میں دیسی بولیوں کی بڑی ملاوٹ تھی۔ اس لیے اسے غیر معیاری قرار دیتے ہوئے اسے اشدھ کہہ دیا گیا تھا اس میں "ر" کی آواز "ل" میں بدل جاتی تھی مثلاً راجہ کو (لاجہ) اور لاکھو کو (راکھو) بولا جاتا تھا۔ اس لیے یہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی پورے شمالی ہندوستان میں کوئی ایک زبان موجود نہیں تھی ویدک سنسکرت کے پہلو بہ پہلو بول چال کی زبان بھی تھی جب ان دونوں میں فرق زیادہ بڑھا تو ادبی سنسکرت وجود میں آ گئی۔ اسی زمانے میں زبان کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی اور وہ زبان اپنے اصل مفہوم میں بن سنور کر سنسکرت ہو گئی۔ سنسکرت سے مراد شستہ و رفتہ زبان ہے جو اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں عام بول چال کی زبان بن گئی تھی۔ ادب کی زبان تھی۔ قواعد نویسوں نے اس کے اصول وضع کیے، قاعدے اور قواعد بنائے قواعد نویسوں کی جکڑبندیوں سے ان کا دائرہ محدود ہی ہوتا گیا۔ اس کے باوجود وہ مسلسل ترقی کرتی رہی۔

یہاں تک کہ مختلف آریائی زبانوں کا آغاز ہونے لگا سنسکرت پر زوال

آنے لگا اس کے چند در چند وجوہ تھے۔

پہلا یہ کہ اس کا تعلق محض ادب اور علم تک رہ گیا تو عوام کا محاورہ رفتہ رفتہ پر پرزے نکالنے لگا جو آگے چل کر فطری یا پراکرت زبان کہلایا۔

دوسرے وہ مذہبی انقلاب تھا جو مہاویر سوامی اور مہاتما گوتم بدھ کی عوامی تحریکوں کے ذریعہ وجود میں آیا ان تحریکوں نے عوامی بولیوں یعنی پراکرتوں کو اختیار کیا۔ اس طرح سنسکرت کی بالادستی پر ایک زبردست ضرب پڑی۔

پہلی پراکرت۔ پالی:۔ سنسکرت کے ساتھ ساتھ وہ دیسی بولیاں بھی تھیں جو شروع سے ہی عوام کی زبان رہی تھیں۔ عوام کا محاورہ یا عوام کی بولی ٹھولی کو پہلی پراکرت کہا گیا ہے جو ٹکسالی سنسکرت سے مختلف تھی۔ عوام کی بولی ٹھولی کا ادبی روپ پالی ہے جس میں براہمنوں اور پرہمنوں کے بجائے بدھ بھکشوؤں کے پیغام کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ نمونے اشوک کی لاٹوں پر یا جین اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں۔ پالی کو قدیم ماگدھی بھی کہا گیا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ان پراکرتوں کے تحت کی جائے گی جنھیں ہند آریائی کا عہد وسطیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہند آریائی کا عہدِ وسطیٰ

جسے (۶۰۰ ق م) سے (۱۰۰۰ ء) تک پھیلایا جا سکتا ہے یہ دور دراصل پراکرتوں کے آغاز و ارتقاء کا عہد ہے۔ پراکرت کے معنی فطری زبان کے ہیں یہاں ان سے مراد یہ ہے کہ وہ فطری زبانیں جو سنسکرت پر لگائی گئی پابندیوں اور قواعد نویسوں کی جکڑبندیوں کے سبب سنسکرت کے پہلو بہ پہلو وجود میں آ گئیں ہیں جن میں فطری سلاست و روانی تھی اور عوام کی روز مرہ ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں اس عہد میں سنسکرت عوام کی زبان نہیں رہی تھی خواص کی زبان بن چکی تھی، علم کے سوتے پھوٹتے تھے، وہ دیو بانی تھی اس کو ایک قسم کا تقدس حاصل ہو گیا تھا اس لیے عوام پر اس کا ایک قسم کا رعب طاری تھا۔ باوجودیکہ سنسکرت کے پہلو بہ پہلو فطری یا دیسی زبانیں اپنے اوج کمال کی طرف بڑھ رہی تھیں، یہ فطری یا پراکرت بولیاں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں علاقائی خصوصیات اور علاقائی تقسیم کے مطابق موسوم ہیں اس عہد میں پانچ پراکرتیں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) **مہاراشٹری پراکرت**:۔ سب سے اہم پراکرت تھا۔ اس عہد کا بیشتر شعر و ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ یہ گیت و سنگیت اور لوچ دلچسپ کی زبان تھی۔ آج تک مہاراشٹر کے سنگیت کو بالادستی حاصل ہے یوں تو اس کا تعلق مہاراشٹر کے علاقے سے صاف ہے تاہم اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کے نزدیک یہ پراکرت پورے ملک کی نمائندگی کرتا تھا اور کچھ کے نزدیک یہ شورسینی پراکرت ہی کی ایک نکھری و ستھری صورت تھی۔

(۲) **شورسینی پراکرت**:۔ اس کا مرکز شورسین (دوآبہ کا وسطی حصہ یعنی متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اسی کو سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل تھی۔ اس پر سنسکرت کی چھاپ اور چھوٹ پڑنا فطری بات تھی اس لیے کہ آریوں کی عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیتیں اسی علاقے سے متعلق رہ چکی تھیں۔

(۳) **ماگدھی**:۔ مگدھ دیس یا جنوبی بہار کی پراکرت تھی یہ اپنے مرکز سے بہت دور ہونے کے سبب نہ صرف غیر معیاری بلکہ غیر مہذب سمجھی جاتی تھی۔ اسے پالی سمجھنا درست نہیں۔

(۴) **اردھ ماگدھی**:۔ شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے میں بولی جانے والی پراکرت اردھ ماگدھی کے نام سے موسوم ہے یہ علاقہ بہار سے الٰہ آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ اردھ ماگدھی کی قدیم شکل میں ہی جین اور بدھ مت کے مبلغوں نے اپنی تبلیغ کی۔

(۵) **پشاچی پراکرت**:۔ پشاچی بہ معنی کچا گوشت کھانے والے یہ پراکرت بہت گمنام رہی ہے۔ یہ مغربی پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی یہ خالص ہند آریائی نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں ہند ایرانی کی خصوصیات موجود تھیں۔

ہند آریائی کا عہدِ جدید

یہ دور (۱۰۰۰ء) سے حال تک محیط ہے۔ یہ دراصل ان اپ بھرنشوں کا دور ہے جو فطری زبانوں یا پراکرتوں کے پہلو بہ پہلو سر اٹھا رہے تھے جس طرح عوام کی ضرورتوں کی فطری انداز میں کفالت کی تھی۔ اسی طرح اپ بھرنشوں نے پراکرتوں کو ہٹا کر خود وہ جگہیں سنبھال لیں اور عوام کی روزمرہ ضرورتوں کا بار اپنے سر لیا جس طرح سنسکرت کو شدھ اور پاک صاف رکھنے کے لیے اس کے قواعد نویسوں نے اس کو قاعدے قانون کی پابندیوں میں جکڑ دیا تھا اور یوں اس کا بڑھتا ہوا دہانہ سکڑ گیا تھا اسی طرح پراکرت کے قواعد نویسوں نے جب پراکرتوں کے لیے کچھ ایسے ہی کڑے اصول ایجاد کیے تو اس کی ترقی کو بھی صدمہ پہنچا اور اس کا چوڑا ہوتا ہوا دہانہ سمٹ گیا زبان کو خالص رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے والے چند لوگ ہوتے ہیں۔ جو اسے عوام کی ہمدردیوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ روزمرہ ضرورتیں گفتار کے مختلف اسالیب اختیار کرتی ہیں جن میں صناعی اور بناوٹ کے بجائے ضرورت کی لغات پر زور رہتا ہے۔ چنانچہ ایک ٹوٹا پھوٹا شکستہ محاورہ عوام کی بارگاہ میں باریانے اور پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہی پراکرتوں کے ساتھ بھی ہوا۔ چنانچہ اپ بھرنش جس کے معنی تقریباً وہی ہیں جو ریختہ

نکلے آگے بڑھنے لگے اور سنسکرت کے اب تمام علاقوں میں پراکرتوں کی جگہ اپ بھرنش تقریباً انھیں ناموں سے آ گئے۔ ان اپ بھرنشوں کی لسانی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ آج کی جدید ہند آریائی زبانیں تقریباً سب کی سب انھیں اپ بھرنشوں سے نکلی ہیں۔ یہ کل پانچ اپ بھرنش ہیں جو اس طرح ہیں۔

(۱) **شورسینی اپ بھرنش**:۔ علاقہ شورسین یعنی متھرا وغیرہ میں بولے جانے والے اپ بھرنش۔ اس سے (۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی نکلی (جس سے موجودہ اردو اور ہندی نکلی (۲) راجستھانی (۳) پنجابی (۴) گجراتی اور پہاڑی بولیاں۔

(۲) **ماگدھی اپ بھرنش**:۔ یہ بڑے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی۔ مختلف جگہوں پر مختلف ناموں سے یاد کی جاتی تھی۔ بنگال میں پراچیہ گوڑ اور ڈھکی تھی جس سے موجودہ آسامی اور بنگالی نکلیں۔ اڑیسہ میں یہ اتکل کہلائی جس سے موجودہ اڑیہ نکلی۔ بہار کی تمام بولیاں اسی سے نکلیں بہار کی "مگہی" ماگدھی کی بگڑی شکل ہے۔

(۳) **اردھ ماگدھی**:۔ بہار سے الہ آباد تک کا علاقہ۔ اس میں پوربی یا مشرقی ہندی کی تمام بولیاں اسی کے تحت آتی ہیں۔ یعنی اودھی، چھتیس گڑھی، بھوجپوری وغیرہ۔

(۴) **مہاراشٹری**:۔ سنسکرت میں جس صوبہ کو مہاراشٹر کہا گیا ہے وہ برار تھا۔ وہی اس کا خاص مرکز تھا۔

(۵) **پراچڈ اور کیکئی اپ بھرنش**:۔ پراچڈ سے سندھی اور کیکئی سے

سے لہندا کی سندھی اور لہندا میں مماثلت ہے۔

جدید زبانوں کا تعلق اپ بھرنش اور پراکرت کے وسیلے سے سنسکرت سے جا ملتا ہے اس طرح جدید ہند آریائی زبانیں اپنی اصل میں ایک ہی سرچشمے سے فیض یاب ہوتی ہیں۔

جدید ہند آریائی زبانیں اور انکی درجہ بندی

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ اس میں بے شمار بولیاں اور ان گنت زبانیں بولی اور برتی جاتی ہیں۔ یوں تو ہر تیس میل پر لب و لہجہ بدل جاتا ہے اس کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جس کو اپنی آسانی کے لیے ہم اس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

ملک کے شمالی و مغربی حصے میں لہندا، مغربی پنجاب اور سندھی صوبہ سندھ میں بولی جاتی ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں مرہٹی وہ واحد ہند آریائی زبان ہے جو صوبہ بمبئی، برار اور کھاپی کے جنوبی اضلاع میں بولی جاتی ہے اس کے بعض اسماء و افعال دکنی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً کسی ایک کے لیے "کینک" انجانا کے لیے لبلانا۔ نہیں کے لیے "نکو" تاکیدی "ﭻ" کا استعمال دکنی اردو کو مرہٹی کی دین ہے۔

مشرقی ہندوستان میں آسام میں "آسامی" بنگال میں "بنگالی" اڑیسہ میں "اڑیا" بہار میں "بہاری" یعنی "میتھلی" دربھنگہ کے آس پاس "مگہی" گیا اور پٹنہ میں "بھوج پوری" گورکھپور اور بنارس اور چمپارن کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

مشرقی ہندی ہریانی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مغربی ہندی کے مماثل ہیں مگر بعض خصوصیات کے اعتبار سے یہ بہاری و بنگالی سے بہت قریب ہیں مشرقی ہندی کی تین خاص بولیاں ہیں۔

۱۔ اودھی ۲۔ بگھیلی ۳۔ چھتیس گڑھی

اس کے افعال پر مغربی ہندی کا اثر ہے۔ اسماء اور ضمائر کے اعتبار سے مشرقی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ مغربی اودھی میں فعل کی معمولی شکل برج بھاشا کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے آؤں، جاؤں، وغیرہ ہندی ادب میں اودھی کو اس لیے بلند مقام حاصل ہے کہ اس میں جائسی، تلسی کی سی بلند قامت شخصیتیں ہو گزری ہیں۔

پہاڑی بولیاں:۔ پوربی پہاڑی۔ یہ نیپال میں بولی جاتی ہے۔ دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ درمیانی پہاڑی اس کی دو شکلیں ہیں۔ کمایونی اور المورہ اور نینی تال کے اضلاع میں بولی جاتی ہے گڑھوالی۔ گڑھوال اور مسوری میں بولی جاتی ہے۔

مغربی پہاڑی:۔ شملا اور آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

گجراتی زبان:۔ یہ کاٹھیاواڑ، بڑودہ میں بولی جاتی ہے اس کی چار اہم بولیاں ہیں۔ مارواڑی یا میواڑی، مالوی، جے پوری، اور میواتی۔

پنجابی:۔ دریائے سندھ سے ضلع انبالہ تک کی بولیوں پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

مغربی ہندی:۔ مغربی ہندی کوئی مستقل زبان نہیں ہے بلکہ وہ اصطلاح ہے جسے سب سے پہلے گریرسن نے اختراع کیا۔ گریرسن کے مطابق اس کا اطلاق ان پانچ بولیوں پر ہوتا ہے جو مغربی یو۔ پی میں بولی جاتی رہی ہیں۔ اور وہ اس طرح ہیں۔ برج، بندیلی، قنوجی، ہریانی اور کھڑی یا ہندوستانی وہ

بولی ہے جسے اردو یا ہندی کی بولیوں میں سب سے اہم بولی بتایا جاتا ہے اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ اپنے مقام پر آئے گی۔ اس عنوان کے دوسرے پہلو یعنی جدید ہند آریائی زبانوں کی درجہ بندی یا گروہ بندی پر گفتگو یہاں کی جاتی ہے دراصل علماء لسان کے مطابق جدید ہند آریائی زبانوں کو بیرونی اور اندرونی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔ ہارنل پہلا شخص ہے جس نے (۱۸۸۰ء) میں اس طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد دو مختلف وقفوں اور گروہوں میں ہوئی دوسرا گروہ جو کافی عرصہ کے بعد ہندوستان میں آیا وہ پنجاب کے میدانوں سے گزرتا ہوا دوآئی گنگ تک پہنچ گیا اور اس نے پہلے گروہ کو مغرب کے جانب کھدیڑ دیا۔ اس طرح دوسرا گروہ اندرونی کہلایا اور اس کی زبان اندرونی کہلائی جبکہ یہ پہلا گروہ جو بیرونی حصوں میں پھیل گیا اس کی زبانیں بیرونی کہلائیں گریرسن نے ہارنل کے اندرونی و بیرونی نظریے کی تائید تو کی مگر اس کے نزدیک پہلا گروہ اندرونی اور دوسرا گروہ بیرونی ٹھہرتا ہے۔ اس اختلاف سے لسانی حقیقت پر کوئی فرق نہیں آتا۔

گریرسن کی تقسیم کا نقشہ

۱۔ بیرونی زبانیں

(الف) شمالی مغربی شاخ (۱) لہندا (۲) سندھی

(ب) جنوبی شاخ (۱) مرہٹی

(ج) مشرقی شاخ (۱) آسامی (۲) بنگالی (۳) اڑیا (۴) بہاری

۲۔ وسطی زبانیں (۱) پوربی ہندی

۳۔ اندرونی زبانیں:۔ (۱) مغربی ہندی (۲) پنجابی (۳) گجراتی (۴) راجستھانی (۵) بھیلی (۶) خاندیشی

۴۔ پہاڑی زبانیں:۔ (۱) مغربی پہاڑی یا نیپالی (۲) درمیانی پہاڑی (۳) مغربی پہاڑی۔ گریرسن نے یہ درجہ بندی دونوں زبانوں کی ساخت اور ان کے کینڈوں کا تجزیہ کرنے کے بعد کی ہے اس کے دلائل کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) دونوں گروہوں کی زبانوں میں تلفظ کا فرق ہے مثلاً اندرونی زبانوں میں "سا" کا صحیح تلفظ برقرار رہتا ہے۔ بیرونی زبانوں میں "سا" "شا" میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً بنگالی اور مرہٹی دونوں بیرونی زبانیں ہیں۔ میں "سا" "شا" میں بدل جاتا ہے نیز "سا" "ہا" میں بدل جاتا ہے۔

(۲) دونوں گروہوں میں اسماء کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ "کا" "کے" "کو" "سے" "نے" وغیرہ کو الفاظ کے ساتھ جوڑنے کا رواج تمام اندرونی زبانوں میں ہے اسے زبان کی حالت تفصیلی کہا جاتا ہے (انالیٹکل) جبکہ بیرونی زبانوں میں یہ رواج نہیں ہے وہ انالیٹکل سے ترقی کر کے سنتھیٹکل حالت میں پہنچ گئی ہیں۔ مثلاً اردو میں "اُس کا یا اُس کی میں" "کا" اور "کی" اسم سے الگ اپنے مفاہیم رکھتے ہیں۔ بنگالی میں اسم کے ساتھ جو "ار" لگایا جاتا ہے وہ اسم ہی کا ایک جزو ہوتا ہے اس کے الگ کوئی معنی نہیں ہوتے۔

(۳) بیرونی زبانوں کے فعل ماضی سے اس کے فاعل کی جنس کا پتہ چل جاتا ہے جبکہ اندرونی زبانوں میں ہر فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے

جبکہ اندرونی زبانوں میں ہر فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے
مثلاً اردو میں "اس نے مارا" سے جنس کا پتہ نہیں لگتا جبکہ بنگالی کے "مارا لام" سے تجنیس کا پتہ لگ جاتا ہے۔

آریائی زبانوں کے نئے محققوں نے گریرسن کے مذکورہ دلائل سے سخت اختلاف کیا اور اس کے ایک ایک استدلال کو غلط ثابت کر دیا یہ اس طرح ہے۔

(۱) "سا" کا "ہا" میں بدلنا اندرونی میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً سنسکرت "تاس" کا "تاہ" ہو جانا۔ اعداد میں "گیارس، بارس" کا گیارہ بارہ اور چوستر کا چوہتر ہو جانا۔

(۳) جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان ـــــ مرہٹی

مذکورہ نقشے کی رو سے ہندوستانی آریائی زبانوں کی درجہ بندی کے لیے پوری ملک کو کل پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی شمالی، جنوبی، مشرقی درمیان اور مدھیہ دیش درمیان اور مدھیہ دیش لسانی حیثیت سے بڑی گہری مماثلت ہے ان کی سرحدیں بھی ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں یوں بھی ملک کی سب سے بڑی آبادی انھیں حصوں میں ہند آریائی کنبہ کی اہم ترین زبانیں اور بولیاں استعمال کرتی ہے۔ پنجابی گجراتی اور راجستھانی، دیار مغربی کی بولیوں سے بہت گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔ زبان کی اس تقسیم کو زیادہ عام فہم بنانے کے لیے ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے جو بات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مدھیہ دیش کی زبان (مغربی ہندی) | درمیانی زبانیں | شمالی مغربی ہندوستان کی زبانیں | مشرقی ہندوستان کی زبانیں | جنوبی ہندوستان کی زبانیں

برج، بندیلی، قنوجی، کھڑی، ہریانی

لہندا، سندھی

مرہٹی

(۱) مدھیہ دیش سے گہرے تعلق والی زبانیں

پنجابی، راجستھانی، گجراتی، پہاڑی

بہاری، اڑیا، بنگالی، آسامی

۲۔ بیرونی زبانوں سے گہرے تعلق والی زبانیں

اودھی، چھتیس گڑھی، بگھیلی

مغربی ہندی

مغربی ہندی نہ کسی زبان کا نام ہے نہ کسی ایک بولی کا ملک کے مشرقی اور مغربی علاقوں کی بولیوں کو متاثر کرنے کے لیے گریرسن نے پہلی بار اپنی کتاب "لسانیاتی جائزۂ ہند" میں یہ تخصیص برتی۔ گریرسن کے مطابق مدھیہ دیش میں بولی جانے والی پانچ آریائی بولیاں "مغربی ہندی" کی ایک اصطلاح یا ایک نام کے تحت آتی ہیں جب کہ مشرقی علاقے میں بولی جانے والی میتھلی، اودھی، چھتیس گڑھی، بگھیلی اور بھوجپوری کو وہ مشرقی ہندی بولیاں کہتا ہے

مغربی ہندی کی یہ پانچ بولیاں ہیں۔

کھڑی، ہریانی، برج، بندیلی، اور قنوجی

مغربی ہندی کی ان تمام بولیوں کا تعلق اس شورسینی اپ بھرنش سے بتایا گیا ہے جو اپنے ماضی میں پراکرت کے واسطے سے سنسکرت سے متعلق اور متاثر رہا ہے جو اپنے دورِ عروج میں لاہور سے بنگال تک اثر انداز کرتا تھا اور جس سے بے شمار جدید آریائی زبانیں نکلی ہیں۔

مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی اور صرفی و نحوی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انھیں دوسری بولیوں سے مختلف و ممتاز کرتی ہیں۔ ان خصوصیات میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ مغربی ہندی

کی تمام بولیاں زبانوں کے اندرونی گروہ[1] میں اس لیے بھی شامل ہیں کہ وہ سب حالتِ تفصیلی میں ہیں۔ یعنی ان کے قواعد کا عام رجحان تفصیلی ہے اور کھڑی بولی میں یہ رجحان اپنی معراجِ کمال پر ہے۔

مغربی ہندی کی یہ پانچوں بولیاں دو گروہوں میں تقسیم کی گئی ہیں کھڑی بولی اور ہریانی ایک گروہ میں شامل ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں ضمائر اور افعال کا خاتمہ الف پر ہوتا ہے۔ مثلاً افعال میں کہنا، لینا، رہنا وغیرہ ضمائر میں ترا، میرا۔

برج، بندیلی اور قنوجی دوسرے گروہ میں شامل ہیں ان میں افعال اور ضمائر کا خاتمہ (اُو) یا واؤ پر ہوتا ہے مثلاً ضمائر میں میرو اور تہارو (بجائے میرا اور تہارا) اور افعال میں (کہیو) لیجیو، دیکھیو، غالب کا مصرع ہے۔ ؎

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے (یا)

ؔ بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

ان موخر الذکر تینوں بولیوں میں واؤ یا او کے اس استعمال کے باعث ہیجے کو لوری بھی کہا جا سکتا ہے۔

اویا واؤ کو ترجیح دینے والی بولیاں۔

برج بھاشا:۔ برج بھاشا کو شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہا گیا ہے یعنی برج بھاشا مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے

---

[1] اندرونی و بیرونی گروہ سے بحث گزشتہ صفحات میں موجود ہے، صفحہ ۱۲

میں شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت کی مجموعی خصوصیات کی حامل ہی ہے اس کی "سچی جانشینی" کے تین اہم ترین اسباب ہیں۔

۱۔ برج بھاشا ہی ادب کی زبان تھی۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنشوں میں جو بھی ادب اور قواعد کی کتب تخلیق و تصنیف ہوئیں۔ اس سلسلۂ تصنیف و تالیف کے منقطع ہونے کے بعد جو درمیان کا بہت بڑا خلاء ہے۔ اس خلاء کو برج ہی نے پُر کیا۔ اپ بھرنشوں کے زور و طاقت کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے بعد اور جدید آریائی زبانوں کے وجود میں آنے سے پہلے تک جو لمبی مدت ہے اس میں اگر کوئی ادبی تخلیق وجود میں آئی تو وہ برج بھاشا ہی کے ذریعے آئی۔ نہ صرف ہریانی، بُندیلی اور قنوجی میں ادب کے نمونے موجود نہیں ہیں۔ کھڑی کے ادبی نمونے بھی بہت بعد کے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کھڑی کا پٹ اپ بھرنشوں میں بھی نظر آتا ہے مگر خود کھڑی کا اپنا ضخیم نمونہ بہت بعد میں اس وقت وجود میں آیا جبکہ برج بھاشا اپنے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی اس لیے اس روایت کی حقیقی وارث اور اس سلسلے کی اہم کڑی برج بھاشا ہی ہے جو اپ بھرنشوں اور پراکرتوں کے واسطے سے سنسکرت سے جا ملتی ہے۔

۲۔ برج کی اس اہمیت کا راز بھگتی تحریک بھی ہے اس مذہبی تحریک کا اصل مرکز متھرا تھا۔ برج بھاشا متھرا، بندرابن، اکبرآباد (یا) آگرہ، بھرت پور، وغیرہ کی خاص بولی تھی بھگتی تحریک کے جملہ سرگرمیاں برج میں ہی ہوتی تھیں۔ تحریک کے یہ اپدیشک دور دور تک اپنی بانی کو پھیلاتے تھے اسی طرح برج بھاشا کے اثرات ملک گیر تھے یہی سبب ہے کہ وہ اپنے خاص علاقوں

سے نکل کر کھڑی بولی، ہریانی، بندیلی اور قنوجی کے علاقوں تک مار کرتی تھی۔ ان کے علاوہ برج کے اثرات کا یہ سلسلہ گجراتی، راجستھانی اور میواتی پر محیط تھا۔ ان اثرات کا ایک تاریخی پس منظر بھی تھا۔ دراصل متھرا کو شروع سے ہی ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے لامحالہ اس میں بولی برتی جانیوالی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ جس طرح شورسینی اپ بھرنش راج پوتی عہد میں لاہور سے بنگال تک اثر انداز ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کی جانشین کو بھی وہی قدر و منزلت حاصل تھی۔

۳۔ برج بھاشا کے عروج کو اپنے منتہائے کمال تک پہنچانے کی رہی سہی کسر بعد کے ادوار میں اس وقت پوری ہو گئی جب مغل اعظم اکبر نے راج دھانی دہلی کے بجائے آگرہ کو بنایا۔ اس طرح زبان دہلوی کا سورج اس وقت تک کے لیے گہن میں آگیا جب تک شاہجہاں نے اپنی راج دھانی دوبارہ آگرہ سے بدل کر دہلی کو بنایا۔ شاہجہاں کے اس اقدام سے قبل برج بھاشا کو ایک قسم کی سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ بازاروں منڈیوں ہی میں نہیں محلات شاہی اور سرکاری دفاتر میں بھی برج کا بول بالا تھا۔

بندیلی یا بندیل کھنڈی: بندیلی کو بندیل کھنڈی بھی اسی مناسبت سے کہا گیا ہے کہ وہ بندیل کھنڈ کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ ہمیرپور، باندہ، جھانسی اور جالون کے ضلعوں پر مشتمل ہے۔ بندیلی ان اضلاع کے علاوہ مین پوری، شمالی آگرہ اور ایٹہ تک بولی جاتی ہے۔ اس بولی میں ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔ کیشوداس اور پدماکر کے سے بڑے بڑے شاعروں اور نقادوں

کا تعلق اسی بولی سے ہے۔ آلہا اودل کے پرجوش گیت پہلے پہل اسی بولی میں لکھے گئے۔

بندیلی کی صوتی خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معکوسی "ڑ" اکثر حالتوں میں سادہ "ر" میں بدل جاتی ہے۔ جیسے جاڑا کے بجائے جارا۔ ساڑی کی جگہ ساری، جھاڑو کے مقام پر جھارو وغیرہ۔ مونث بنانے کے لیے ایک "ن" کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً اس میں تیلی کی تیلن کو تیلنی کہتے ہیں۔

بندیلی میں بعض تلفظ کی جداگانہ خصوصیات ہیں مثلاً بیٹی کو بٹیا، گھوڑے کو گھوڑا۔ اسی طرح تلفظ میں بَیل، مَیل، پَیسہ وغیرہ کے بجائے۔ بیل، میل اور پیسہ اسی طرح بولتے ہیں جیسے بھوپالی اور ٹونکی اردو میں بولے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ تلفظ میں نت، ہمیشہ ثبوت نظر آتا ہے۔

قنوجی بولی: یہ بولی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں اپنی اصلی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ اس کا نام قنوج کی مناسبت سے ہے۔ قنوج ضلع فرخ آباد میں ہے اس مقام کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ راجپوتوں کے راٹھور ونش کا مرکز رہ چکا ہے۔ ان سے بھی پہلے رامائن میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

یہ برج کے ہمہ گیر اثرات کے سبب ادبی طور پر کبھی پنپ نہیں سکی۔ اس میں ایسے الفاظ میں جن کا خاتمہ مصمتوں پر ہوتا ہے، "وا" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً گھر کا گھروا ہو جاتا ہے ایک اور خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اگر لفظ مصمتے پر ختم ہو تو اس میں "ی" کا مزید اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً نُجد کو

تھدی اور دور کو دوری کہنے کا رواج قنوجی میں کئی مقام پر پایا جاتا ہے۔
قنوجی اور برج کے قواعد میں اس درجہ مشابہت ہے کہ گریرسن کو قنوجی
کی الگ سے کوئی بولی ماننے میں تامل رہا ہے۔

ہریانی بولی:۔ ہریانی کو بانگرو اور جاٹو کہا گیا ہے۔ ہریانی
دہلی کے شمالی مغربی اضلاع کرنال، رہتک، حصار، گڑگاؤں، وغیرہ میں
بولی جاتی ہے۔ اس علاقے کے لوگ زیادہ تر فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔
یہ علاقہ سیاسی اتھل پتھل سے بھی کچھ زیادہ دوچار ہوتا رہا ہے۔ اس
لیے اس علاقے کی بولی میں بہت زیادہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں
یہ ایک طرف کھڑی کے اثرات کو قبول کرتی رہی۔ مثلاً یہاں کرتا اور کہتا
بھی ملتا ہے۔ اور پنجابی کے زیر اثر کردا اور کہندا بھی ملتا ہے۔ ہریانی کے
اسی تبدل و تغیر کے سبب گریرسن اسے کھڑی بولی کی ہی ایک شکل بتاتا
ہے تاہم کچھ لوگ اسے گنوارو زبان سے تعبیر کرتے آئے ہیں عبدالواسع
ہانسوی کی غرائب اللغات ہریانی زبان کی پہلی تصنیف کہی جاتی ہے
جس سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ ہانسی اور ہانسی کے نواح
میں بولی جانے والی ہریانی ایک زمانے میں معیاری بولی جاتی تھی۔

کھڑی بولی:۔ کھڑی کا علاقہ میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور کے
اضلاع اور دہرہ دون کا میدانی علاقہ ہے۔ مرادآباد، خورجہ اور
بجنور، رام پور میں بھی کھڑی بولی ہی بولی جاتی ہے۔ میرٹھ، مظفر نگر
اور سہارن پور کی کھڑی بولی مستند کہی جاتی ہے۔ باوجودیکہ ان جگہوں

پر بھی لہجوں کا فرق آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مظفر نگر کی طرف بڑھیے تو
تشدید کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔

ان علاقوں کی کھڑی میں سب سے بڑی خصوصیت افعال کی
یہ صورت ہے کہ "میں مارتا ہوں" کے ساتھ میں ماروں ہوں، وہ مارے
ہے، تو مارے ہے بھی ملتا ہے۔ اسماء کی جمع کھڑی میں الف نون لگا کر بنائی
جاتی ہے۔ مثلاً ان کا رنگ ضمائر میں ترا، میرا کے محل پر تجھ، مجھ کا استعمال
ملتا ہے۔ مثلاً

ع تجھ گل بدن کی بو (یا) تجھ عشق میں جل جل کر

اُنیں کا استعمال محمد افضل کے بارہ ماسہ میں بھی ملتا ہے اور محمد قلی قطب شاہ
کے اشعار میں بھی موجود ہے اصل میں یہ تمام خصوصیتیں قدیم کھڑی کی ہیں
کھڑی کا ادب پندرہویں صدی سے قبل تقریباً صفر کے برابر ہے اسکے باوجود
کھڑی کا پٹ اپ بھرنشوں کی قدیم ترین تصنیفات میں نظر آتا ہے کھڑی
کا یہ پٹ کیا ہے۔ اسکو سمجھنے کے لیے دو باتیں جاننا ضروری ہیں پہلی بات
یہ ہے کہ کھڑی کے حروف لاحقے اور افعال جو کھڑی کے سوا کسی
اور بولی میں مروج نہیں کھڑی کے نا ٹنڈے ہیں مثلاً کا، کس، اُس،
اِس جس، نا، تا، آ، گا، یہ سے یا دکنی اردو کا سیتی اور سوں وغیرہ
دوسرے کچھ الفاظ ہیں جو اپ بھرنشوں کے عہد سے لے کر قدیم اردو دکنی
تک متواتر مروج رہے ہیں مثلاً دھر یا دھیرا تا دلہ باولہ، اچنا، بیتا تا،
ناؤں، ٹھاؤں وغیرہ ان میں سے بہت سی شکلیں ان گاؤں، گراموں

میں جوں کی توں آج بھی موجود ہیں جو کھڑی کے خالص علاقے ہیں۔ کھڑی بولی ایک طرف دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے اس کا کوئی ادبی نمونہ پندرہویں صدی سے قبل کا موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپ بھرنشوں کی تصنیفات میں اس کی جھلک مل جاتی ہے دوسری طرف یہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے میرٹھ اور اس کے مضافات میں بولی برتی جاتی تھی۔ اس کے اثرات بہت ہمہ گیر تھے۔ یہ اپنے علاقے سے نکل کر پنجابی کو متاثر کرتی تھی۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد کھڑی بولی کے محاورے نے ایک خاص رخ پر ڈھلنا شروع کیا۔ پنجابی کے اثرات پروان چڑھنے لگے۔ اردو کی تہہ میں جو بولیاں ہیں۔ ان میں کھڑی بولی کو اس قسم کی بالادستی حاصل ہے۔ کہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔

اُردو کی ابتدا کے نظریے

علماء لسان کے درمیان اس باب میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے کہ اردو کی تہہ میں کون سی بولی ہے گریرسن نے اپنی کتاب لسانیاتی جائزہ ہند میں کھڑی بولی کو ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت دی۔ تاہم اس کو برج بھاشا اور پنجابی کے امتزاج و آمیزش کا نتیجہ بھی بتایا۔

پروفیسر ژول بلاک نے محض ہریانی بولی کی تاریخی قدامت اور بنیادی اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی اردو میں ہریانی بولی کے اثرات پر بہت زور دیا ہے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے نہ صرف پنجابی کی قدامت پر زور دیا۔ بلکہ پنجابی کو ایک طرح سے اردو کی ماں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے قدیم اردو یا دکنی کے اکثر کھوئے ہوئے رشتوں کی کھوج کرتے ہوئے ہریانی، کھڑی اور میواتی وغیرہ کے ذریعہ اردو کی ابتداء کے متعلق ایک نظریہ کا خاکہ پیش کیا۔ ان کے نزدیک برج بھاشا نے اردو کا معیاری لب و لہجہ ضرور متعین کیا ہے اس لیے وہ اردو کی بہن تو ہو سکتی ہے ماں نہیں ہو سکتی۔ اردو کی تہہ میں ایک نہیں ایک سے زیادہ بولیاں ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ اس کھڑی بولی کے حق میں دیا ہے جس کی روایت پالی پراکرت سے جا ملتی ہے۔ ان کے نزدیک کھڑی بولی دہلی اور میرٹھ میں بولے جانے والی اپ بھرنش سے ارتقا پائی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے متعلق اردو سندھی سے نکلی ہے کیونکہ مسلمانوں کا سب سے پہلا سابقہ سندھ کی وادی سے گزر کر پورے ملک پہ محیط ہو جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں، مولانا امام بخش صہبائی اور مولوی محمد حسین آزاد کے مطابق اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔

اردو اور سندھی: اختلاف رائے کے بہت سے وجوہ ہیں یہاں ایک ایک نظریے سے گفتگو ہے۔ اردو سندھی سے نہیں نکلی۔ اس کے صاف و صریح اسباب یہ ہیں۔

اولاً یہ کہ سندھی جس اپ بھرنش اور پراکرت سے نکلی ہے، اس کا نام پشاچی ہے ایسی اپ بھرنش اور پراکرت ہے جس کا ہند آریائی خاندان سے بہت دور کا اور بہت دیر کے بعد قائم ہونے والا تعلق ہے اسکی اجنبیت اور دور افتادگی کے سبب بعض لوگ پشاچی کو ہند ایرانی خاندان کی زبانوں میں شامل کرتے ہیں، جبکہ اردو کا تعلق ان شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے ہے جو ہند آریائی خاندان کی سچی جانشین تھیں۔

ثانیاً یہ کہ سندھی زبان کا تعلق ہند آریائی خاندان کے بیرونی گروہ سے ہے جبکہ اردو کا تعلق اندرونی گروہ کی بولیوں سے ہے اس طرح سندھی حالت تفصیلی میں نہیں ہے جبکہ اردو حالت تفصیلی میں ہے۔

ثالثاً سندھی کے عروض و قواعد اور رسم الخط پر عربی کے اثرات نے سندھی کی جداگانہ خصوصیات کو اپنے اندر ضم اور مدغم کر لیا جبکہ اردو کی صوتی اور صرفی و نحوی خصوصیات میں مقامی بولیوں کو بالادستی حاصل رہی ہے اور اس کا آریائی کردار کبھی بھی مجروح نہیں ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو میں آج بھی ۷۵ فیصد سے زیادہ الفاظ مقامی بولیوں کے ہیں۔ حروف میں سابقے و لاحقے خالص ہند آریائی ہیں آوازوں میں جہاں اردو نے محض ۵ آوازیں عربی و فارسی سے لی ہیں وہیں اس نے ہم اہکار آوازوں کا پورا سیٹ ہند آریائی خاندان سے لیا ہے۔

اردو اور پنجابی: پروفیسر حافظ محمود شیرانی اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" کی بنیاد اسی نظریے پر رکھتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ پنجابی اردو کی ماں ہے۔ اسکے لیے انھوں نے ایک طرف تاریخی اور سیاسی حالات اور واقعات سے استدلال کیا۔ دوسری طرف لسانیاتی طور پر اپنے دعویٰ کی دلیل پیش کرنے کی کوشش کی، سیاسی اور تاریخی طور پر انکی دلیل یہ ہے کہ دہلی کے داخل ہونے سے پہلے مسلمان تقریباً پونے دو سو سال پنجاب میں رہے اس لیے لا محالہ اتنی طویل مدت میں روزمرہ ضروریات کی کفالت پنجابی نے کی ہوگی۔ پنجابی الفاظ اصوات لب و لہجہ، تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے قاعدے سب کے سب پنجابی کے برتے گئے ہوں گے کیونکہ وہ لوگ پنجاب میں تھے اور ملک کے مغربی حصے کی کوئی بولی اس قابل نہیں تھی کہ اسکے اثرات پنجاب کو بھی متاثر کرتے بلکہ مغربی علاقوں یعنی دہلی وغیرہ

کے اضلاع کی بولیاں گنی گزری تھیں۔ دلی اور اس کے آس پاس میں برج
کا بول بالا تھا۔ برج بھاشا عوام اور ادب دونوں کی زبان تھی اپنے اس
دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے شیرانی صاحب نے کھڑی کے علاقے کے دو بزرگوں
مخدوم بہاء الدین برناوی اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی تصنیفات کا حوالہ
دیا ہے جو برج میں ہیں اور ان سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان اضلاع کی زبان
برج بھاشا تھی۔ رفتہ رفتہ پنجابی اور برج کے اثرات زائل ہوتے گئے یہاں
تک کہ عہدِ شاہجہانی میں اردوئے معلیٰ معیاری مانی گئی۔ پنجابی اور اردو کی
یکسانیت کو ثابت کرنے کے لیے پروفیسر شیرانی نے جو لسانیاتی مقدمہ قائم کیا ہے
وہ اس طرح ہے:۔

اصوات میں یکسانیت:۔

اگر لفظ شروع میں الف ممدودہ ہوتا ہے تو دونوں میں
الف مفتوحہ رہ جاتا ہے، مثلاً آم کا انب کسی لفظ کا دوسرا حرف اگر
الف ہے تو اسے دونوں میں حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً کان سے کن
لات سے لت۔ ہاتھ سے ہتھ یہ شکلیں دکنی کے علاوہ آج بھی اردو کے
مرکبات میں موجود ہیں، مثلاً کن پھول، کن میلیا، نک کٹا۔ پنجابی اور
اردو میں بعض حروف کا آپس میں تبادلہ ہو جاتا ہے مثلاً پنجابی
نیم مصوتہ "و" اردو میں مصمتے "ب" سے بدل جاتا ہے۔ وچار، بچار
ویاہ کا بیاہ، وگاڑ کا بگاڑ، وکاؤ کا بکاؤ، واری کا باری
وغیرہ پنجابی حلقی نفسی آواز اردو میں تالوی سے بدل جاتی ہے

مثلاً ایہہ سے اس۔ اودھے اس گاہ سے گھاس وغیرہ پنجابی میں
لفظ کے شروع میں نفسی "ہ" اور اردو میں مصوتہ الف سے بدل
جاتی ہے مثلاً ہک کا ایک ہو کا اور۔

۲۔ صرفی و نحوی یکسانیت:۔

مصدر کا قاعدہ پنجابی اور اردو میں یکساں ہے نا لگا کر صیغہ
امر بنایا جاتا ہے، مثلاً اٹھنا، بیٹھنا، جانا، آنا۔ لانا وغیرہ۔
تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدوں میں یکسانیت ہے یعنی جب مذکر
"ی" پر ختم ہو تو "ن" لگا کر مونث بنا لیتے ہیں، مثلاً موچی سے
موچن، دھوبی سے دھوبن وغیرہ جب اسم مذکر مصمتے پر ختم ہو تو
"نی" لگا کر تانیث بنا لیتے ہیں۔ مثلاً اونٹ سے اونٹنی مغل سے مغلانی
فقیر سے فقیرنی وغیرہ۔ اردو کا لاحقہ تانیث "نی" دراصل پنجابی
کی علامت تانیث ہے جو عورتوں کو مخاطب کرنے کے لیے ہے
مثلاً نی کڑی، اردو اور پنجابی دونوں میں اسماء اور اسماء صفات
الف پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً لڑکا، منڈا، اچھا، چنگا، بڑا، وڈا۔
اسماء صفت، جمع، واحد اور تذکیر و تانیث میں اپنے موصوف کے مطابق ہوتے
ہیں مثلاً اونچا گھوڑا، اچا گھوڑا، بڑے لڑکے یا وڈے منڈے فعل واحد
و جمع اور تذکیر و تانیث میں اپنے فاعل کے مطابق ہوتا ہے مثلاً گھوڑا آیا،
گھوڑے آئے دونوں میں یکساں شکل ہے۔ عورتیں آئیں۔ عورتاں آئیں
اردو میں شروع میں یہی انداز تھا۔ سودا کا مشہور شعر ہے ؎

دل کا کوئی قصور نہیں ہے   آنکھیں اس سے لڑ پڑیاں
مار رکھا سو اس نے ہم کو   کس ظالم سے جا لڑیاں

دونوں میں اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث کے مطابق ہوتی ہے اس کی مثال میں پروفیسر شیرانی نے ذیل کا اقتباس دیا ہے :-

اردو :- اس میں کوٹھڑیاں رنگ برنگی ، بعض چاندی کیاں بعض یاقوت سرخ کیاں بعض زرد کی .... اور بعض جواہرات سفید کیاں
(پنجاب میں اردو ص۸۸)

پنجابی :- اودوے وچہ کوٹھڑیاں رنگ برنگیاں ہیں بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت سرخ دیاں تے بعضیاں زمرد دیاں ...... بعضیاں چٹے جواہرات دیاتے ،
(پنجاب میں اردو ص۸۹)

ماضی مطلق کی شکلیں دونوں میں یکساں ہیں ، مثلاً وہ آیا ، او آیا ، مستقبل کا اصول دونوں میں ایک ہے ، مثلاً گا ، گی ، گے اس کے علاوہ سینی بھی علامت مستقبل کے طور پر پنجابی ، ملتانی ، لہندا اور دکنی اردو میں استعمال ہوتا رہا ہے امر کا قاعدہ بھی دونوں میں ایک ہے واؤ لگا کر دیکھا ہے دیکھو ، پیا ہے پیو لایا ہے لاؤ ، کھایا ہے کھاؤ وغیرہ تقابلی مطالعے کے نتیجے میں دونوں میں صوتیاتی سطح کے علاوہ صرفی و نحوی مماثلتیں ہیں یہ شروع میں بہت تھیں امتداد زمانہ سے کم ہوتی گئیں ، بعد میں کھڑی بولی کے اثرات غالب آگئے اس طرح پروفیسر شیرانی کے مطابق اردو کی بنیاد پنجاب میں رکھی گئی ۔ پنجابی اردو کی ماں ہے پنجابی اور اردو کی اس یکسانیت کے باوجود یہ ثابت

نہیں ہوتا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے ، اس کے دو بنیادی سبب ہیں ۔ ایک سبب یہ ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرفی و نحوی اور صوتی مماثلتیں ان دونوں کے علاوہ اس علاقہ کی تقریباً تمام بولیوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں وہ خصوصیتیں محض پنجابی سے مختص نہیں ہیں ان میں کوئی خصوصیت ہریانی بولی کی ہے کوئی برج بھاشا کی کوئی میواتی کی دوسری کچھ بنیادی اختلافات ہیں ۔ اسکے علاوہ ایسے بہت سے شواہد ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کھڑی اور ہریانی بولی پنجابی سے قدیم ہیں ۔ کسی زمانے میں پنجابی انھیں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی کھڑی بولی کی قدامت اسکے نام سے ظاہر ہے جسکی شہادت خود پروفیسر شیرانی نے ان لفظوں میں دی ہے ۔ "کھڑا[1] ..... اس سے کھڑا ہونا اور کھڑا رہنا وغیرہ مصادر بنا لیے گئے ہیں ۔ اہل لغات اس کا ماخذ پراکرت کا کھڈ دلو بتلاتے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ کھڈ داد پراکرت سے گزر کر اپ بھرنشوں کے عہد تک کھڑی بنا جب کے ادوار ہیں ایک خاص علاقے کی ایک خاص بولی کا وجہ تسمیہ بن گیا ۔ اسکے برخلاف پنجابی کا نام صاف مسلمانوں کی دین نظر آتا ہے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کا کو پنجابی دا سے قدیم بتاتے ہیں اتنا ہی نہیں اردو کی آواز "ت" جو فعل حال میں استعمال کی جاتی ہے پنجابی دے سے قدیم ہے یعنی پڑھتا اور کرتا ، پنجابی کے پڑھدا ، اور کردا سے قدیم ہیں ۔ شیخ فریدالدین شکر گنج[2] کا یہ قول کہ "دونوں کا چاند بھی بالا ہے" دا کے مقابلے میں کا کی قدامت پر دال ہے پروفیسر محمود حسن خاں

---

[1] پنجاب میں اردو ۔ از شیرانی ص۱۶

[2] صوفیائے کرام کا کام ۔ از مولوی عبدالحق ۔

کے مطابق ڈا اور ڈھ آوازیں جو ہریانی کھڑی اور پنجابی کو بہت مرغوب ہیں وہ اردو نے پنجابی سے نہیں لی گئیں بلکہ کھڑی اور ہریانی کے واسطے سے کسی پراکرت سے لی گئی ہیں۔ جدید اردو میں ڈا اور ڈھ پر ڑا اور ڑھ کی ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ پنجابی میں ڑھ معدوم ہے۔ پنجابی کو تشدید بہت مرغوب ہے اردو کو بے جا تشدید ناپسند ہے۔ مثلاً پنجابی میں سکھ اردو میں سکھ پنجابی میں اجڈ اردو میں اجڈ وغیرہ۔ اردو نے کبھی بھی ضمائر کی پنجابی شکل اختیار نہیں کی مثلاً اسی، تسی، تو، اڈ، ڈے وغیرہ ضمائر کی یہ شکل قدیم ترین اردو کی کسی بھی تصنیف میں نظر نہیں آتی۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قدیم اردو نے اپنے عبوری دور میں جن اثرات کو قبول کیا اور جو بادی النظر میں پنجابی کے اثرات نظر آتے ہیں وہ پنجابی کے نہیں ہیں بلکہ قدیم ہریانی اور برج بھاشا کے ہیں۔ کھڑی اور ہریانی نے قدیم زمانے میں اپنے علاقوں سے نکل کر پنجاب کو متاثر کیا جس کا سب سے بڑا ثبوت پنجاب کے مغربی علاقے میں لہندا اور مشرقی علاقہ میں مشرقی پنجابی کی موجودگی ہے۔ تحریری طور پر اس کا دوسرا ثبوت گرونانک کی شاعری ہے جو پنجاب میں بیٹھ کر پنجابی میں شاعری کرنے کے باوصف کھڑی سے بڑی حد تک اثرانداز ہوئے ہیں۔ لیکن جس طرح گورونانک کی شاعری میں کھڑی کا آب و رنگ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ پنجاب میں پنجابی کے بجائے کھڑی بولی جاتی تھی اسی طرح یہ نتیجہ نکالنا بھی مغالطہ ہوگا کہ اردو پنجابی کی بیٹی ہے۔ وہ اس کی رشتہ کی بہن ہو سکتی ہے۔

اردو اور ہریانی: سب سے پہلے پروفیسر ژول بلاک نے ہریانی کی تاریخی حیثیت اور اہمیت پر ۱۹۲۹ء میں زور دیا۔ بلاک کے بعد ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی ۱۹۳۲ء میں اسی قول کا اعادہ کیا۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے بھی ۱۹۳۰ء میں پنجابی کے ساتھ قدیم ہریانی کی بھی سراہنا کی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی تہہ میں جن بولیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں کھڑی بولی کے پہلو بہ پہلو ہریانی بولی کو بھی نمایاں کیا اور بتایا کہ قدیم اردو کا پنجابی پن اس کا ہریانی پن بھی ہے اس کے علاوہ اردو اور قدیم ہریانی کی صوتیاتی مشابہتوں کو اس طرح دکھایا ہے۔

(۱) قدیم اردو یا دکنی اور قدیم ہریانی میں معکوسی آواز "ڑ" کے بجائے "ڈ" کا استعمال ملتا ہے۔ مثلاً بڑا کی بجائے بڈا۔ بوڑھا کی بجائے بڈھا، جھوڑ کی جھوڈ، گڑھا کے بجائے گڈھا وغیرہ۔

(۲) ہریانی میں حرف علت کو لمبا کر کے بولا جاتا ہے۔ قدیم اردو میں بھی یہی شکلیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً پچ کے بجائے ساپچ اور پڑ کے بجائے پاڈ۔

(۳) ان غنہ کا بے جا استعمال پنجابی سے زیادہ ہریانی میں ملتا ہے اردو میں یہ استعمال روز کا مشاہدہ ہے مثلاً برسات سے برسانڈ، کوچے سے کونچے، کوے کوں کواڑے کنواڑ، چاول سے چانول وغیرہ۔

(۴) ہریانی میں ہکار آوازیں سادہ کر کے بولنے کا رواج عام ہے قدیم اردو میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً تج بجائے تجھ۔ مج بجائے مجھ، کچ بجائے کچھ۔

مذکورہ شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ہریانی کا اردو سے بہت گہرا تعلق رہا ہے اردو نے اپنی ارتقا کی کئی منزلیں طے کرنے کے باوجود بھی قدیم ہریانی

کی کئی شکلوں کو بدستور برقرار رکھا ہے اس میں ڑ کے ساتھ ڈ کی شکل آج بھی جوں کی توں برقرار ہے اسی طرح ن غنہ کا بے جا استعمال اردو کے خاص علاقوں میرٹھ اور اسکے اضلاع میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے ماضی میں قدیم ہریانی نے اردو کی جو دست گیری کی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ ہریانی اردو کی ماں نہیں اسکی پشت پناہ ہے۔

اردو اور برج بھاشا:۔ مولوی محمد حسین آزاد نے بڑی قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ فرمایا کہ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اسی سے ملتی جلتی بات ان سے پہلے سرسید اور مولانا امام بخش صہبائی آثار الصنادید میں کہہ چکے تھے۔ ہر چند کہ ایک مغالطہ تھا مگر اس مغالطے کے کچھ تاریخی، سیاسی اور لسانی اسباب تھے۔

اردو نے برج بھاشا سے کئی لسانیاتی اثرات اپنے دوران ارتقا میں قبول کیے ہیں۔

اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ اردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا نے متعین کیا ہے کھڑی بولی میں مصوتہ اے (e) ہے برج میں اَے (ae) ہے معیاری اردو میں بھی اسے پر اَے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً پیسہ، مَیل، بَیل، مَیں وغیرہ برخلاف اسکے پیسہ، میل، بیل، میں وغیرہ بولنے سے آدمی پہچانا جاتا ہے کہ اس کا تعلق بھوپال یا ٹونک کی ریاستوں سے ہے۔

امر کے صیغے میں واؤ مجہول کی موجودگی برج بھاشا کی خصوصیت ہے اردو کے شعرائے متوسطین سے اب تک اس کی روایت اور رواج ہے۔ مثلاً کہیو، بھیجیو دیکھیو، اٹھیو وغیرہ غالب کا مصرعہ ہے۔

ع بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو۔

معکوسی آوازوں میں برج بھاشا نے ڈا اور ڈھ کو کبھی منھ نہیں لگایا۔ اردو جب جنوب سے شمال کی طرف آئی اور جب سنوری نکھرتی گئی ویسے ہی ویسے اس نے کھڑی کی ڈا اور ڈھ پر برج کی ڑا اور ڑھ کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً علی گڑھ (پہلے گڈھ لکھا جاتا تھا) گڑھا، بوڑھا وغیرہ۔

ضمائر میں اردو نے برج بھاشا سے دو ضمائر لے کر اس طرح شروع سے ہی اپنے قالب میں ڈھال لیے کہ وہ اردو کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ وِس اور وِن (وس نے کہا) یا (وِن کو جانا ہے) ٹھیٹ کھڑی کے علاقوں رام پور، خورجہ، مراد آباد، وغیرہ میں برج کے زیر اثر یہ ضمائر مستعمل ہیں دہلی میں بھی یہ بولے جاتے ہیں۔

برج بھاشا کی طرح اردو میں بھی سَون، پرے، لیے، یہ مستعمل ہیں مذکورہ صورتیں برج اور اردو کے اتفاق کی تھیں۔ اختلاف کی شکلیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

اختلافات:۔ (۱) واحد متکلم میں اور ہوں۔ برج میں موجود ہیں اردو میں معدوم (۲) برج بھاشا کے مُو اور مو ہیں، قدیم اردو میں مجھ یا مج جدید اردو میں مجھے ہے (۳) مخاطب واحد و جمع:۔ برج بھاشا میں تو اور توں کے ساتھ تُمیں اور تمیں یہ شکلیں اردو میں نہیں ہیں (۴) برج بھاشا میں ترو، تمہارو اور تُم رو ملتا ہے اردو میں تھارا، تیرا اور تمہارا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ برج میں تائیں، توہی، تومے، تیراؤ، تیراؤں، تمہوں، تمھائیں، موہی، موئے

میراڈ، ہماڈں اور ہمیں ملتا ہے۔

برج کا	اردو میں
برج کا تمھو	اردو میں تمھیں
برج کا ہمارو	اردو میں ہمارا
برج کا میرو	اردو میں میرا وغیرہ

(۵) اسماء کی جمع بنانے کے لیے اردو میں کئی قاعدے ہیں۔ ان میں ایک نون لگا کر بھی جمع بنائی جاتی ہے برج میں حرف ن کے اضافہ سے جمع بنائی جاتی ہے مثلاً گھوڑے کی جمع گھوڑن، بھینس کی جمع بھینسیں

(۶) مادے کے اندر تا لگا کر اردو میں فعل مضارع بنایا جاتا ہے برج میں حرف ت لگا کر فعل مضارع بنا لیا جاتا ہے، مثلاً کرت، پرت، جات، ہوت، (اس ضمن میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا قول ہے کہ[1] برج نے بارہویں صدی کے قریب اردو فعل حال کے صیغے لیے۔ اردو میں اس کے مزاج کے مطابق یہ صیغے الف پر ختم ہوتے تھے۔ برج نے الف گرا کر کرتا کو کرت ضمہ ت کے ساتھ بنایا۔"

(۷) فعل مارا، یا مارا کے بجائے ماریو یا مارو برج بھاشا میں استعمال میں آتا ہے۔

(۸) برج بھاشا میں مستقبل کی جو مختلف شکلیں ملتی ہیں ان میں گو، یا ہ مروج ہے مثلاً چلوں گو یا چلی ہوں ان میں بھی ہوں کی شکل زیادہ عام ہے۔ ہ کی آواز پوری ادا نہیں ہوتی۔

(۹) حرف میں کو، سے، میں اردو میں کھڑی بولی کے مطابق استعمال ہوتے ہیں

---

[1] داستان زبان اردو۔ از ڈاکٹر شوکت سبزواری

برج میں یہ کو، سے اور میں ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ ڑ اور ڑھ، ڈ اور ڈھ میں برج بھاشا میں موخرالذکر آوازیں سرے سے موجود نہیں ہیں ہرچند کہ معیاری اردو میں ڑ، ڑھ کو ترجیح دی جاتی ہے مگر اسوقت جبکہ یہ آوازیں لفظ کے درمیان میں آئیں مثلاً بڈھا کے بجائے بوڑھا، گڈھا کی بجائے گڑھا وغیرہ لیکن اسکے علاوہ اردو نے ڈ اور ڈھ کی آوازوں کو برقرار رکھا ہے۔ مثلاً لفظ کے شروع میں ڈلیہ اور ڈاک وغیرہ الفاظ میں جبکہ ڑ سے کوئی لفظ ہی نہیں بنتا۔ اسکے علاوہ لفظ کے آخر میں ن غنہ کے ساتھ ڈ آتی ہے مثلاً رانڈ، سانڈ، کھنڈ، بھانڈ وغیرہ یوں ڈال درمیان میں مرکب الفاظ میں آتے ہیں، مثلاً مرگھٹ، سڈول، بے ڈول، ڈانواڈول، درمیان میں چند ایسے مفرد لفظ ہیں جن میں ڈ اردو میں آتی ہے، مثلاً گنڈیریا اور گڈری ہی نہیں کچھ ایسے مخرج بھی آتے ہیں جب اردو آخر میں ڑ، پر ڈ کو ترجیح دیتی ہے۔ مثلاً لاڑ کے بجائے لاڈ اور امرڑ کے بجائے امنڈ

اردو کو پسند ہے ضروری نہیں کہ مذکورہ لسانیاتی دلائل نے مولوی محمد حسین آزاد اور سید وغیرہم کو یہ رائے دینے پر مجبور کیا ہو کہ اردو برج سے نکلی ہے چند چیزیں لسانیاتی امور کی بھی انکے سامنے رہی ہوں گی یوں بھی اگرچہ تمام لسانیاتی پہلو انکے سامنے رہتے تو انکی رائے برج کے حق میں نہ جاتی جیسا کہ لسانیاتی تجزیے سے ثابت ہوا کہ جہاں اردو اور برج بھاشا میں اشتراک کی بہت سے پہلو ہیں وہیں اختلاف کے بےشمار پہلو ہیں۔ دراصل ان بزرگوں کے سامنے لسانیاتی تجزیے کے بجائے وہ تاریخی اور سیاسی حالات تھے جو بار بار مغالطے میں مبتلا کرتے تھے۔ ان میں برج بھاشا کی تاریخی اور ادبی حیثیت تھی۔ برج میں متواتر ادب ترتیب پا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جو دیگا تائیں لکھی گئیں ان میں ڈنگل کے پہلو بہ پہلو پنگل نے بھی عوام کے احساسات کی ترجمانی کی۔ یہ پنگل برج کی ہی ایک قدیم شکل تھی، برج میں تصنیفات و

تالیفات کا کام برابر جاری رہا جبکہ ہریانی اور کھڑی میں ادبی طور پر کچھ بھی سامنے نہیں آیا تھا۔

اس کے بعد کرشن بھگتی کی تحریک کا مرکز متھرا اور بندرابن ہے یہ خالص برج کے علاقے تھے برج بیک وقت عوام اور خواص کی زبان بن گئی ایک طرف اس کا بلند پایہ ادب تھا دوسری طرف عقیدت مندی نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہندوؤں میں اس کی خاص قدر و منزلت تھی چنانچہ کلام ولی کی دلی میں آمد ۱۷۲۰ء تک ملک کے شمالی حصے کے ہندو ادیب اور شاعر سور داس کی بانی یعنی برج میں شعر کہنا سعادت سمجھتے تھے۔ برج بھاشا کی ادبی حیثیت کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی تسلیم کرتے تھے چنانچہ ۱۶۷۶ء میں مرزا خان کی تحفۃ الہند برج بھاشا کی پہلی قواعد فارسی میں لکھی گئی۔ ان کے بعد عہد عالم گیر میں امداد بھوانی داس گوالیاری سے فارسی میں ایک کتاب تصنیف کرتے ہیں ظاہر ہے یہ وہی گوالیاری یا برج ہے جس کے فصحا سے خان آرزو اپنی نوادر اللغات میں سند لیتے ہیں اور ان سے پہلے ملا وجہی اپنی سب رس میں جا تران گوالیار کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بڑا عامل راجدھانیوں کی تبدیلی کے اثرات ہیں جن کی طرف اشارہ پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب میں کیا ہے[1]۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہاں کے زمانہ تک آگرہ لودھیوں، سوروں اور مغلوں کا پایہ تخت تھا جو عین برج کے علاقہ میں واقع ہے۔

راجدھانیوں کی تبدیلی اور اردو کی اثر پذیری کا حال دیکھنے کے لیے ہمیں تاریخی حقائق کو سامنے رکھنا چاہیے محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے گیارہویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ مسلمان پنجاب کو شروع سے ہی اپنے زیر اثر کر لیتے ہیں۔ بے شمار لوگ پنجاب کے علاقوں میں توطن اختیار کرتے ہیں۔ گو غزنوی کے حملے اس میدان میں کوئی نئی

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۳۶

بساط نہیں بچھاتے تاہم وہ غوریوں کے لیے ایک میدان ضرور ہموار کر جاتے ہیں شہاب الدین محمد غوری دہلی کے آخری راجپوت تاجدار پرتھوی راج کو ۱۱۹۲ء میں ہرا کر دہلی میں پایہ تخت بنانے کا دروازہ کھول دیتا ہے غوری کی مرگ ناگہانی کے بعد خاندان غلامان کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک پہلی مرتبہ راجدھانی لاہور سے ہٹا کر دہلی کو بناتا ہے۔ غلام خاندان کی بادشاہت سے بلبن تک اور بلبن سے خلجیوں تک دہلی بدستور راجدھانی رہتی ہے علاء الدین خلجی کے عہد میں اس کا ایک سپہ سالار ملک کافور دکن کی مہم پر روانہ ہوتا ہے اور ورنگل اور مالابار تک کو فتح کر کے خلجیوں کے قلم رو میں شامل کر دیتا ہے۔ دولت آباد بسایا جاتا ہے۔ اس کے آس پاس کے علاقے میں ملک کافور کے ساتھ آئے ہوئے بے شمار فوجی دکن کی وطنیت اختیار کر لیتے ہیں خلجیوں کے بعد تغلقوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ محمد تغلق دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دہلی ایک طرح سے اجاڑ ہو جاتی ہے ہر شخص کو ہجرت کا حکم تھا بعد میں اس حکم میں تبدیلی بھی آتی ہے مگر اس وقت تک دہلی کی بہت بڑی آبادی دکن کی شہریت قبول کر لیتی ہے بہت سے لوگ دہلی واپس آجاتے ہیں تغلقوں کے بعد لودھیوں کے عہد میں سکندر لودھی دہلی سے پایہ تخت اٹھا کر آگرہ کو پایہ تخت بنا دیتا ہے۔ آگرہ مغلوں کے عہد میں پایہ تخت رہتا ہے یہاں تک کہ شاہجہان ۱۶۳۶ء میں پایہ تخت آگرہ کے بجائے دہلی کو بناتا ہے۔ راجدھانیوں کی اس تبدیلی سے اردو کے ارتقاء اس کی اثر پذیری اور اثر آفرینی پر بڑا اثر پڑا یہاں اسی سے گفتگو ہے۔

جب تک پایہ تخت پنجاب کے علاقوں لاہور میں رہا اور خود لوگ پنجاب کے علاقوں میں رہے تو انھوں نے پنجاب کو اپنا وطن تصور کیا۔ پنجاب کے سبزہ زاروں کی تعریفیں اپنی فارسی شاعری میں کیں اسکے بعد خواجہ مسعود سعد سلمان نے ترکی اور فارسی کے علاوہ کسی زبان ہندوی میں بھی

شاعری کی زبان ہندوی سے مراد ہندوستان کی کوئی زبان ہو سکتی ہے اور کیونکہ وہ پنجاب کے علاقے میں تھے اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ پنجابی ہو اور کیونکہ ادب کی زبان پنجابی اسوقت بن سکتی ہے جب وہ اس سے پہلے عوام کی روزمرہ رہ چکی ہو اور کیونکہ وہ اہل پنجاب کی روزمرہ تھی اس لیے لامحالہ تازہ واردوں نے اسے اختیار کیا ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے پنجاب میں سابقے کی مدت لگ بھگ دو صدی پر محیط ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ ان دو صدیوں میں ایک نئی مقامی زبان کا ڈول پڑا ہوگا۔ اس کے بعد جب خاندانِ غلامان کے عہد میں مسلمان دہلی آئے تو انھوں نے اس نوزائیدہ بولی کو ایک نئے محاورے اور عروض سے بولنا اور ایک نئے رسم خط سے لکھنا شروع کیا۔

اس ضمن میں اردو کے ماہرین لسانیات کی رائے میں اختلاف ہے پروفیسر محمود شیرانی کے مطابق اردو زبان کا ڈول پنجاب ہی میں پڑ جاتا ہے جبکہ پروفیسر مسعود حسین خاں کے مطابق یہ ڈول پنجاب سے دہلی میں آنے کے بعد پڑتا ہے۔ موصوف کے مطابق مسلمان پنجاب سے آئے تو وہ فارسی آمیز پنجابی بولتے تھے نہ کہ قدیم اردو۔ پروفیسر شیرانی کا طرزِ استدلال صحیح ہوتے ہوئے یہ استدلال غلط ہے کہ اردو پنجابی کے بطن سے ہے پنجابی کے وطن سے اس کا تعلق اتنا ہی ہے کہ ہندی اعضائے صوت کچھ نئی آوازیں پیدا کرنے کے قابل ہونے لگے تھے۔ وہ اپنے پہلے مرحلے میں فارسی آمیز پنجابی بولنے کے اہل ہوئے اور دوسرے مرحلے میں انھوں نے اپنی اصل کو پانے کی جستجو کی اور یہ سب تبدیلی راجدھانیوں کی تبدیلی سے ممکن ہوئی۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ اسوقت شروع ہوا جب ابھی دہلی آئے ہوئے مسلمانوں کو تو صرف سو سال ہی گزرے تھے۔ دہلی اور اس کے مضافات کی بولیاں مسلمانوں کے زیر اثر

عروض و قواعد اور رسم خط میں ڈھل رہی تھیں۔ ابھی زبان کا مسئلہ ادھر بچہ ہی تھا کہ دولت آباد کا حادثہ ۱۳۲۷ء میں پیش آ گیا۔ بہت بڑی آبادی نے دکن کا توطن اختیار کر لیا۔ فیروز تغلق کے عہد ۱۳۴۷ء میں علاءالدین حسن گنگوہ بہمنی نے دکن کی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور تقریباً دو صدیوں تک دکن کی ایک طاقتور مقامی حکومت کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس حکومت نے اپنی بقا اور سالمیت کی جدوجہد میں جو تاریخی اقدام کیے اس میں ایک اہم ترین فیصلہ یہ تھا کہ اردو کو سرکاری زبان بنایا گیا یہ قدیم اردو یا دکنی اردو تھی جسے ایک طرف دربار اور سرکار کی سرپرستی حاصل تھی دوسری طرف صوفیاء اور اہل اللہ اپنی دعوت و تبلیغ کا کام اسی میں سرانجام دے رہے تھے تیسری طرف ادیب اور شاعر اسی زبان میں اپنی شعری تخلیقات اور نثری تصنیفات پیش کر رہے تھے شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سید اکبر حسینی کے سے صوفی بزرگ نظامی، خیالی، اور فیروز کے سے شاعر اسی عہد کی یادگار شخصیتیں ہیں جنہوں نے قدیم اردو کے نشوونما میں زبردست کام کیا بہمنی سلطنت کے بعد اور اسی کی بنیاد پر جب دکن میں پانچ خود مختار ریاستوں بیدر، برار، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کا قیام عمل میں آیا تو ان کے والیانِ ریاست نے اپنی ادب پروری اور اردو نوازی کا ثبوت دیا۔ ان میں خاص طور سے بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندانوں نے اردو کی زبردست خدمت کی صوفیوں، شاعروں اور ادیبوں میں میران جی شمس العشاق، شاہ حاتم، امین الدین علی، ذہبی، غواصی، نصرتی، مقیمی، رستمی قابل ذکر ہیں۔ دکن میں اردو نوازی کی مہمات سر کی گئیں اور اردو ایک اجنبی ماحول میں ایک خاص انداز میں پروان چڑھی۔ ماحول

کی اجنبیت یہ تھی کہ دکن دراویدی خاندان کی زبانوں کا مرکز ہے اور خالص ہند
آریائی زبان ہے اس لیے اس ماحول میں اسکی ارتقا کے اتنے سارے سامان موجود
ہونے کے باوصف اس میں ایک انگھڑپن اور نامانوس انداز جگہ پاتا گیا اس میں
ایک طرف دہلی اور دہلی کے مضافات میں بولی جانے والی کئی بولیوں کا آب و رنگ
تھا دوسری طرف اس نے دکن سے قریب آریائی خاندان کی دو زبانوں گجراتی اور
مرہٹی کے معمولی اثرات کو بھی قبول کیا تاہم اس نے اپنے بنیادی وصف کو یہاں بھی
ہاتھ سے جانے نہیں دیا یہاں بھی وہ اپنے جداگانہ عروض اور رسم خط کو
بدستور اختیار کیے رہی۔

عین اسی وقت شمال میں اردو آہستہ آہستہ دلوں میں گھر کر رہی تھی اور قریب
تھا کہ تغلق کے بعد پٹھانوں اور سوریوں کے عہد میں فارسی کا طلسم ٹوٹ جائے
کہ مغلوں کا قافلہ نمودار ہوا اور اس نے فارسی کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا
یا فارسی سرکاری زبان بن گئی۔ مسلمان شعراء فارسی میں اور ہندو برج بھاشا
میں شاعری کرنے لگے اس کے باوجود بھی شمال میں گلی کوچوں بازاروں اور منڈیوں
کی زبان اردو یا وہ کھڑی ہی تھی جسے محمد تغلق اس سے بہت پہلے اہل دہلی اور
غیر دلی والے کی شناخت کا پیمانہ مقرر کر چکا تھا اور یہی روزمرہ بول ٹھولی شاعروں
کے منھ کا ذائقہ بدلنے کے کام بھی آتی تھی امیر خسرو سے گرونانک اور نامدیو تک
کے صوفی سنت شعراء کے یہاں اسی کی جھلک ملتی ہے۔

اردو زبان کی تاریخ میں چوتھی مرتبہ راجدھانی اکبر کے عہد میں آگرہ کو

له پنجاب میں اردو ص ۲۳

بنایا جاتا ہے، آگرہ کے برج بھاشا کے علاقے میں ہونے کے سبب برج کے
اثرات اردو پر حاوی آجاتے ہیں، وہ زمانہ برج کے انتہائی عروج کا تھا سوامی ولبھ
آچاریہ نے متھرا کو اپنا مرکز بنایا، برج بھاشا کو عوام سے قریب آنے کا موقعہ ملا۔ ادھر
سرکار نے برج کی سرپرستی کی، اکبر کے لیے مشہور ہے کہ وہ برج میں بھی شاعری کرتا تھا
اس طرح آگرہ پہنچنے کے بعد اردو سے رہی سہی پنجابیت دور ہو گئی، برج نے اردو
کا لب و لہجہ متعین کیا اور کھڑی نے اسے صاف و شستہ کھرا اور نکھرا بنایا آگرہ میں برج
بھاشا کے اثرات غالب تھے مگر کھڑی معدوم نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ بھی
اس کی ہم نوائی کر رہی تھی۔

اس کے بعد شاہجہاں نے ۱۶۴۸ء میں اپنا پایۂ تخت دہلی کو بنایا تو برج کے
اثرات آہستہ آہستہ زائل ہونے لگے دہلی پہنچ کر مغل سپاہیوں اور درباریوں کو نئی لطافتی
لہروں کی شدت سے احساس ہوتا ہے دہلی کے کوچے ایک بار پھر کھڑی کی تازگی
و تازہ کاری سے بولنے اور بجنے لگتے ہیں، عالمگیر کے عہد میں گیت اور سنگیت کا جنازہ
اٹھایا جاتا ہے اور اس کو اس قدر گہرا گاڑا جاتا ہے کہ آئندہ مدتوں تک اسکے
دوبارہ اٹھ آنے کی توقعات بھی ختم ہو جاتی ہیں، اس کے ساتھ ہی برج
کے گیتوں کی مقبولیت رخصت ہونے لگتی ہے غزل کا جادو سر چڑھ کر بولنے
لگتا ہے، کھڑی بولی برج بھاشا کو ہر ہر محاذ پر شکست دیتی ہے عالمگیر کے
آخری عہد میں گولکنڈا بھی سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ بن جاتا ہے ولی اور کلام ولی
کی آمد کا دروازہ کھل جاتا ہے
کلام
دلی کی دکنی میں آمد طبیعتوں کو ایک نئی امنگ اور ولولہ دے جاتی ہے مشاعروں

کے ساتھ مراختوں کی گرم بازاری ہو جاتی ہے طبیعتوں کی جھجک نکل جاتی ہے اور مرزا بیدل اور خان آرزو جیسے فارسی داں اور برج بھاشا نواز اردو میں شاعری کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اردو شاعروں کا بہت بڑا حلقہ پیدا ہو جاتا ہے جن میں معز موسوی خاں فطرتؔ، قدرتؔ، انسانؔ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اس کے بعد ایہام گو شعراء پیدا ہوتے ہیں اور ان کے فوراً بعد مرزا رفیع سوداؔ کے ساتھ میر تقی میرؔ اور نظیر اکبر آبادی آجاتے ہیں جو اس بات کا صاف اشارہ اور ثبوت ہیں کہ کھڑی نے نہ صرف برج کو اپنے علاقے سے بے دخل کر دیا۔ دہلی سے نکل کر اس نے خاص برج کے علاقہ پر حملہ بول دیا اور اس طرح یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد اردو کا عظیم ترین شاعر اسد اللہ غالبؔ آگرے میں جنم لیتا ہے اور خالص اردوئے معلیٰ میں شعر کہنا اور نثر لکھنا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

آخری تجزیہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گیارہویں صدی سے سولہویں صدی تک رائج دھانیوں کی تبدیلی سے اردو زبان کے نشوونما اور ارتقاء پر جو اثرات رہے ان میں جہاں شروع میں پنجابی اور ہریانی بعد میں برج بھاشا اثر انداز ہوئی۔ آخر میں کھڑی کا صاف و شستہ ادب ابھر آیا جو ہر چند شروع سے ہی اردو کی تہہ میں موجود رہا ہے مگر جو سیاسی تبدیلیوں سے ڈوبتا اور ابھرتا بھی آرہا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کھڑی کے بارے میں یہاں مزید تفصیل سے غور کیا جائے۔

اردو اور کھڑی بولی:۔ اردو اور کھڑی بولی کے رشتے کو سمجھنے کے لیے کھڑی بولی کے علاقے اور اس کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے

مدھیہ دیش سے مراد مغربی اتر پردیش اور مشرقی پنجاب کا وہ علاقہ جسے آریوں کے داخلہ ہند سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ دہلی تک مرکزی حیثیت حاصل رہی رگ وید کے آخری اشلوک اسی گنگا جمنی وادی میں تربیت پائے۔ کلاسیکل سنسکرت کی بنیاد متھرا کے آس پاس رکھی گئی سنسکرت کے بعد اسی علاقہ کی پراکرت اور اپ بھرنش کا سکہ چلتا رہا۔ اس کے بعد جب ہندو مسلم ملاپ کے نتیجے میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی تو وہ اسی علاقہ میں بولی جانے والی کھڑی بولی کو بنیاد بنا کر آگے بڑھی۔ شروع میں یہ روزمرہ بول چال کی زبان تھی۔ رفتہ رفتہ ادب کی زبان بھی بننے لگی خواجہ مسعود سعد سلمان سنہ ۱۱۳۰ء کے بعد حضرت امیر خسرو کا کلام صاف و شستہ کھڑی میں ہے ان سے قبل کا ادب یا راجستھانی میں ہے یا برج میں خسرو نے دہلی اور اس کے نواح میں بولی جانے والی زبان استعمال کی خسرو کی پہیلیاں دوسخنے اور انمل بے جوڑ وغیرہ کھڑی کی قدامت کا زندہ ثبوت ہیں۔ مثلاً ؎

ایک تھال موتی سے بھرا	سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے	موتی اس سے ایک نہ گرے
اک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت	بنا پروں وہ اڑ گیا ڈال گلے میں سوت
بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی	مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی

یا ان کی مشہور غزل کے یہ دو مختلف مصرعے

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

ان اشعار میں برج کے اثرات سے زیادہ کھڑی کا صاف و شستہ لہجہ ہے ان میں

دکنی اردو سے زیادہ صفائی چستی اور پختگی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شمال میں اردو نے دکن کی روایت سے مختلف انداز میں ترقی کی اور یہ کہ یہ لب و لہجہ اور یہ انداز معیاری اردو سے زیادہ قریب تھے۔ امیر خسرو کا عہد تیرہویں، چودھویں صدی عیسوی ۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء کا زمانہ ہے خسرو کی زبان میں خالص برج اور برج اور کھڑی کی ملواں شکل کے علاوہ خالص کھڑی کا روپ بھی نظر آتا ہے
انکے بعد نام دیو، کبیر داس، اور گرو نانک کے یہاں بھی زبان کے ملے جلے اور خالص ادب دونوں ملتے ہیں۔ نام دیو ۱۳۱۸ء سے ۱۴۰۷ء مرہٹی کے شاعر تھے ان کی شاعری میں یہ نمونے بھی ملتے ہیں۔

مائی نہ ہوتی باپ نہ ہوتے کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آیا
چند نہ ہوتا سور نہ ہوتا پانی پون ملایا
شاستر نہ ہوتا وید نہ ہوتا کرم کہاں تے آیا

ان کے بعد کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۵ء کا ہے گو ان کی بولی سدھکڑی کہلاتی ہے مگر اس میں بھی خالص کھڑی کے نمونے موجود ہیں۔ ؎

کبیر کہتا جات ہوں سنتا ہے سب کوئی
رام کہہ بھلا ہوگا نہیں تو بھلا نہ ہوئے
آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد رم رم رہوں گا

ان کے بعد گرو نانک کا زمانہ ۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء رہے گرو نانک کی مادری زبان پنجابی ہے مگر ان کے کلام میں بھی کھڑی کا ٹھیٹھ انداز موجود ہے ؎

اس دم دا مینوں کیہے بھروسہ آیا آیا نہ آیا نہ آیا
یہ سنسار رین دا سپنا کہیں دیکھا کہیں نہ ہی دیکھا یا

ان کے بعد تین نام اور آتے ہیں ایک محمد افضل جھنجھانوی کا دوسرا نام میر جعفر زٹلی

تیسرا نام منور خاں، دلیر مرہٹی کا تینوں کھڑی کے شاعر ہیں۔ محمد افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسے یا بکٹ کہانی میں جو زبان ہے وہ بھی کھڑی بولی کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے ؎

اری سکھی پیا کے باغ جا کر
الیس کوں بے وفا سیتی لو کا کر
پیالا حسن کی مے کا پلایا
کیا بے خود نہ مجھ سوں کو رلایا

میر جعفر زٹلی نارنولی تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے مگر ان کی زٹل گوئی کے سبب تقریباً سب نے ہی اپنا دامن بچایا ہے ان کے کلام میں عریانی، فحاشی ہی نہیں گالیاں اور مغلظات ہیں جو ان کی زبان دانی کا ثبوت بھی ہیں ان کی ہزل گوئی میں کھڑی بولی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق عالم سے عجب یہ دور آیا ہے

تیسرا اہم نام منور خاں دلیر کا آتا ہے جنھیں پروفیسر شیرانی نے مراقی لکھا ہے کچھ روایتیں باغپت بڑوت کا باشندہ ٹھہراتی ہیں۔ لیکن میرٹھ کے لوگ انھیں اصل میرٹھ کا باشندہ بتاتے اور ان کے آبائی مکان اور پیشہ کی نشان دہی کرتے ہیں ہر چند کہ دلیر کا زمانہ بہت قدیم نہیں ہے ان کا زمانہ بادشاہ ظفر کا عہد ہے انھوں نے ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ کے حضور میں اپنا کلام پیش کیا تھا اور وہاں سے داد و ستائش پائی تھی۔ دلیر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ٹھیٹھ دیہاتی لہجہ ہے۔ اس کلام میں کھڑی بولی کی ایک ایسی شکل نظر آتی ہے جو اپنے اصل روپ میں آج بھی جوں کی توں موجود ہے اس کلام کا مطالعہ اس لیے بہت اہم ہے کہ مغربی اضلاع کی بیشتر آبادی انھیں

گاؤں گراموں میں رہتی اور انھیں محاورے اور روز مرے کو استعمال کرتی ہے جو آج سے تقریباً اکیسو پچیس برس پہلے دلمیر نے استعمال کیے تھے یہی نہیں دلمیر کی زبان الفاظ کی اصل شکلوں تک رہنمائی کرتی ہے اور اسکی روایت قدیم اپ بھرنشوں سے جا ملتی ہے مثلاً ضمائر میں ہمارا، تمہارا کا استعمال۔ اس لیے لسانیاتی مطالعہ کے لیے بہت اہم ہے ادب کی زبان ہمیشہ گفتگو اور روزمرہ بول چال کی زبان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ مگر کلیات دلمیر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اس نے اس زبان کو سادگی اور سیدھے سادے انداز میں لکھ دیا ہے جو اس زمانے میں بولی جاتی تھی۔ اور جو نہ صرف ان گاؤں میں آج بھی بولی جاتی ہے جن کی تعداد مغربی اضلاع میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح بہت زیادہ ہے یہ زبان شہروں میں رہنے والی آبادی کا بیشتر حصہ آج بھی بولتا ہے دھوبی، کمہار، چمار، کمہار، نائی نان بائی، قصائی، سقے بے شمار طبقے ہیں جو دلمیر کے محاورے کو بے دھڑک اور جھجک استعمال کرتے ہیں اس کلام سے چاہے شاعری یا اصناف ادب میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچا ہو تاہم لسانیاتی مطالعہ کے اعتبار سے یہ کام بہت اہم ہے اس نے ایک دور کے زبان کو محفوظ کر لیا ہے۔ یہ کھڑی کی وہ شکل ہے جسے اکھڑ اور خالص کھڑا لہجہ کہا جائے گا ظاہر ہے یہی کھرے پن کی دلیل بھی ہوتی ہے بے شک اس میں نستعلیقیت نہیں ہے شائستگی کی کمی ہے مگر اسکی سادگی بتاتی ہے کہ تہذیب و تمدن کی نشو و نما نقش نے ابھی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا ہے۔ یہ تصنع، بناوٹ، دکھاوٹ اور ریا اور رعایت سے

عاری ہے۔ اور اس کا یہی فطری پن اس کا نشانِ امتیاز ہے۔

یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ عوام کا فطری لہو جب پہلے پہل پراکرتوں کی شکل میں نمودار ہوا ہوگا اس میں نیا البیلا پن اور طرحداری رہی ہوگی۔ اس میں جو پنہاریاں نظر آتی ہیں انکے نین برچھی اور کٹاری انکی بلکیں وراتی کے دانے لگتے ہیں۔ یہاں چاہِ زنخداں کے بجائے ٹھوڑی کی گل بدنی کی جگہ دیسی بھاری ملتے ہیں جو جسم کی گدازہٹ کو اور حسین بنا جاتے ہیں۔ نمونہ ؎

تری کون جات پنہاری — نین نے نینوں برچھی ماری

تری پڑک بنی درنتی دانتے — تری ٹھوڑی بھواں کٹاری

یا ہے نار ہمارے من بھاوے — جاگی تیری کمر دیسی بھاری

ان نمونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کھڑی بولی اردو کی روایت خاصی قدیم اور مسلسل ہے کھڑی کے محاورے اور روز مرے نے روزمرہ ضرورتوں کی کفالت بھی کی اور ادب کی شکل اختیار کرنے کے بعد بھی اس نے بہت اہم رول ادا کیا۔ خاصہ عرصہ تک برج بھاشا کو امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ پنجابی نے بھی کافی دنوں تک اردو کی دستگیری کی۔ ہریانی نے بھی پشت پناہی کی، راجستھانی بھی اردو کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئی اردو میں ان تمام بولیوں کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے ابتدائی اردو جو شمال میں لکھی گئی۔ اس میں برج بھاشا کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ کلام ولی کی دلی میں آمد کے بعد بھی جب ریختہ گوئی کا چرچہ عام ہوا اور ایہام گو شعرا مشہور ہوگئے یہ صاف برج بھاشا کا اثر بھی تھا۔ چنانچہ اسکے بعد جب ایہام گوئی کی مخالفت شروع ہوئی اور شاہ محمد حاتم نے ایہام گوئی ترک کرکے اپنے کلام کی نئے سرے سے

تدوینِ "دیوان زادہ" کی شکل میں کی تو اس کے دیباچہ میں یہ صراحت بھی کی کہ بھاکا کو چھوڑ کر عام فہم اور خاص پسند کو اختیار کیا ہے اس طرح رفتہ رفتہ کھڑی بولی کا محاورہ اپنی اصل شان کے ساتھ نکھرتا گیا اور زبان نے اپنی اصل کو پا لیا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کھڑی بولی کی ہی صاف و شستہ اور نکھری و ستھری شکل ہے۔

دکنی اردو اور اس کی خصوصیات

یہاں دکنی اردو سے مراد وہ قدیم اردو ہے جو دکن میں سلطنت بہمنیہ سے لے کر ۱۰۹۸ ہجری گول کنڈہ کے آخری والی ابوالحسن تانا شاہ کے دورِ حکومت میں لکھی گئی۔ اسی عہد میں صوفیا میں شاہ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور سید عبد اللہ حسینی اور شاعروں میں فیروز، خیالی، اور نظامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد جب اس سلطنت کی بنیاد پر پانچ خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں تو ان میں بیجاپور میں عادل شاہی اور گول کنڈہ میں قطب شاہی خاندانوں نے اردو زبان کی زبردست خدمت کی۔ بیجاپور کے والیان ریاست میں ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ نے اردو کی سرپرستی کی۔ اسی ریاست میں شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ نے اپنی دعوت و تبلیغ کے لیے اردو نثر کا سہارا لیا اس ریاست میں نصرتی، مقیمی، ابن نشاطی، رستمی وغیرہ جیسے بڑے اردو شاعر پیدا ہوئے گول کنڈہ کے قطب شاہیوں میں ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، اور عبد اللہ قطب شاہ کے نام اردو نوازی کے لیے سرِ فہرست آتے ہیں۔ شاعروں اور صوفیوں میں ملا وجہی، ملا غواصی، احمد اور عبدل وغیرہ کے نام اپنے جو جاوداں نقوش چھوڑ گئے ہیں ان کا کوئی جواب دکن کے شعر و ادب نے مدتوں پیش نہ کیا یہاں تک

یہاں تک کہ ان سلطنتوں پر زوال آ گیا۔ ابوالحسن تانا شاہ آخری تاجدار ثابت ہوا اور دکن بھی سلطنتِ مغلیہ کا ایک حصہ بن گئی۔

وہ زبان جو دکن میں لکھی گئی اس کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے شمالی ہند کی زبان سے مختلف اور ممتاز کرتی ہیں۔ ذیل میں انھیں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ دکنی زبان میں تشدید کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ یہ شاید پنجابی اور ہریانی کا اثر تھا۔ اردو نے اپنی ترقی کے دوران میں بہت سے ہند آریائی الفاظ کو سہل کر لیا لیکن دکنی میں ان کی پرانی شکل برقرار رہی۔ مثلاً
دکن میں ہتّی اور سُنّا
اردو میں ہاتھی اور سونا۔ ہو جاتا ہے۔

۲۔ دکنی میں ہکار آوازوں کو حذف کر دیا جاتا تھا مثلاً سوکھ کو سوک، ہاتھ کو ہت، کچھ کو کچ، مجھ کو مج، بھی کو، بی وغیرہ

۳۔ دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ "ا،ں" لگا کر ہے۔ مثلاً گھر سے گھراں بیل سے بیلاں، رات سے راتاں، دل سے دلاں۔ عورت سے عورتاں۔

۴۔ دکنی میں مؤنث اسماء کی جمع "یں" لگانے سے بنتی ہے مثلاً رات سے راتیں، بیل سے بیلیں، شمالی اردو میں اس کے برخلاف جمع بنانے کے ایک سے زیادہ قاعدے رہے ہیں مثلاً راتوں، چوڑیاں، راتیں آئیں اور فارسی قاعدے کے مطابق علامت کی علامات وغیرہ کئی شکلیں بیک وقت رائج ہیں۔

۱؎ اردو شہ پارے۔ از محی الدین قادری زور ص ۱۷

۵۔ فعل امر کی صورت میں دینا، لینا سے دکنی میں دیئو، لیئو سے ادبی اردو میں یہ شکلیں قابلِ قبول نہیں ہیں مگر عام بول چال میں یہ آوازیں سنی جا سکتی ہیں۔

۶۔ دکنی میں ماضی مطلق بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ مصدر کی علامت (نا) ہٹا کر "یا" لگا دیتے ہیں۔ مثلاً بولنا کے بجائے بولیا۔ کھولنا کے بجائے کھولیا اور دیکھنا کی جگہ پر دیکھیا۔

۷۔ جن لفظوں میں پہلا مصوتہ طویل ہوتا ہے اسے حذف کر دیتے ہیں مثلاً آدمی کا ادمی۔ آسمان کا اسمان آنکھ کا انکھ رہ جاتا ہے۔

۸۔ دکنی میں اکثر درمیان میں آنے والی "ہ" بھی اڑا دی جاتی ہے مثلاً گھبراہٹ کے بجائے گھبراٹ۔ تمتماہٹ کی جگہ تمتماٹ وغیرہ۔

۹۔ دکنی میں علامتِ فاعل "نے" کا استعمال جا و بے جا ہوتا ہے اور جہاں کبھی ہوتا ہے۔ اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً خدا کہیا (خدا نے کہا) لڑکی لکھیا (لڑکی نے لکھا)۔

۱۰۔ دکنی میں نون کا استعمال بھی زائد از ضرورت ہوتا ہے مثلاً کو کے بجائے کوں۔ سے کی جگہ سوں۔ نے کی جگہ نوں وغیرہ

۱۱۔ تاکیدی حروف ہی کی بجائے تاکیدی "چ" ملتی ہے جو مرہٹی کا اثر ہے مثلاً آپیچ، اپچ، دیچ، لیوایچ۔ بھیچ وغیرہ۔

۱۲۔ دکنی میں ضمائر کی بے شمار شکلیں رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دکنی اردو پر بیک وقت کئی بولیوں کا اثر پڑا تھا اور کوئی بولی بھی اس وقت تک معیاری نہیں بنی تھی بعض متروک ضمائر یہ ہیں۔ منج (مجھ) ہمن (ہم) توں (تو) تم کا (تیرا) تمن (تم)

تمنا (تم)، انن (ان) انھیں (ان) ان میں پنجابی کا اسی، تسی، تواڈا، ساڈا کہیں نہیں ہے۔

۱۳۔ مستقبل کے صیغے کے لیے کہیں کہیں پنجابی سی بھی استعمال ہوا ہے مثلاً جس کے دل میں کچھ درد اس کتاب کوں سینے پر تے بلاسی نا۔ (سب رس۔ ملا وجہی)

۱۴۔ اعداد میں گیارہ بارہ کے بجائے کہیں کہیں گیارہ، بارا یا گیاراں باراں لکھا ملتا ہے۔

۱۵۔ عربی کے الفاظ کو سادہ کرنے کا رجحان بھی اس میں رہا ہے مثلاً طمع اور نفع وغیرہ کے بجائے طما، نفا۔

۱۶۔ دکنی میں بالخصوص ملا وجہی کی سب رس میں بقول مولوی عبدالحق انگریزی ادب کا سا تلفظ نظر آتا ہے مثلاً پیاسا کیا منگتا، پانی وغیرہ۔ ان خصوصیات کو ذہن میں رکھنے کے بعد دکنی اردو کے یہ نمونے اردو کی ابتدائی شکل نظر آنے لگتے ہیں ان پر نگاہ نہ کرنے سے قدیم اردو بالکل اجنبی اور نامانوس سی لگتی ہے۔

شمالی ہند کی اُردو
اور
دہلی میں اصلاح زبان کی تحریک

گزشتہ اوراق میں اس حقیقت پر بہت زور دیا گیا ہے کہ جب کبھی گفتگو کی زبان ادب
کی زبان بنی ہے زبان کا بنیادی ڈھانچہ پہلے سمٹا سکڑا اور پھر زوال سے دوچار ہو گیا ہے اس
کا بھی حقیقت سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ ادب کی زبان بننے کا مطلب زبان کی تباہی ہے
اور یہ کہ یہ تباہی آناً فاناً آجاتی ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بول چال کی زبان جس طرح برہا برس
کے استعمال سے ادب کی زبان بننے کی قابل ہوتی ہے اسی طرح ادبی زبان صدیوں تک عوام و
خواص کی ضرورتوں کی کفالت کرتی رہتی ہے نہ اپنے دور کا دستاویزی ثبوت ہوتی ہے اس میں
مستقبل کی بشارتیں اور امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ حال کے حالات و
حوادث سے دوچار ہوتی ہے وہ اپنے زمانے کی عکاسی اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے بھی کرتی ہے
نہ ان کے روزمرے محاورے طرزِ گفتگو اور مختلف اسالیب بیان کو ایک دور سے دوسرے تک پہنچاتی ہے وہ
محسوسات کو تازگی تجربوں کو تجسیم اور کیفیتوں کو قالب عطا کرتی ہے۔

ادبی زبان بننے سے پہلے اس بولی کو جس کی بنیاد پر بعد کے ادوار میں ہندوی، دہلوی
لاہوری، ہندوستانی، ہندی یا اردو بنی کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں
آمد سے پہلے اس نے سر اٹھانا شروع کیا تھا، پنجاب میں ترکوں کی ترک تازیوں کے ساتھ
اس نے بھی پنجاب کے سبزہ زاروں میں اپنی کافر ادائیوں سے دلوں کو موہ لیا تھا ایسے
ہاتھوں نقدِ دل ہارنے والوں میں شروع میں وہ تھے جو اپنے بھر نشوں سے دل گرفتہ اور
بیزار تھے اس کے بعد اس نے نو والائتوں اور تازہ واردوں کو بھی اپنا ارادت مند بنا لیا۔
ابتدا میں یہ ان کے منہ لگی اور سر چڑھ کر بولی اس کے بعد اس کا جادو دلِ درد آشنا
رکھنے والوں یعنی شاعروں کو بھی متاثر کرنے لگا اسی لیے خواجہ مسعود سعد سلمان کا نام آتا ہے،
جو محمد غوری کی فتح سے تقریباً ستر سال پہلے پنجاب میں ترکی اور فارسی کے ساتھ اس عوامی بولی
کو ادب کی زبان بناتے ہیں ان کا "دیوان ہندوی" یقیناً آج دستیاب نہیں ہے لیکن اتنا
طے ہے کہ انھوں نے کسی ہندوستانی زبان میں بھی شاعری کی۔

لیکن ابھی عوام کی بولی میں ادب کی زبان بننے کا کس بل نہیں تھا یوں بھی سیاسی
حالات کی غیر یقینی کے سبب فضا میں بڑا انتشار تھا۔ اذہان و افکار سکون نا آشنا تھے طبیعتوں
میں تکدر اور انقباض تھا، ٹھہراؤ، جمود، سکون و ثبات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسی
لیے روزمرہ بول چال کی زبان کا کوئی کینڈا مدتوں متعین نہ ہو سکا اور جب بول
چال کی زبان اس انتشار سے دوچار ہو تو پھر اس کا ادبی روپ بھی بننے میں دیر
لگتی ہے چنانچہ دیر لگی اور خواجہ سعد سلمان سے چل کر حضرت امیر خسرو تک آتے
آتے دو صدیاں حائل ہو گئیں۔ مگر اس تاخیر سے ایک فائدہ بھی ہوا اور وہ یہ کہ
زبان کا اکھڑ پن بڑی حد تک ختم ہو گیا۔ امیر خسرو نے زبانِ دہلوی میں جو شاعری کی
اس میں کئی بولیوں کی جھلک ملتی ہے۔ یعنی برج بھاشا، کھڑی بولی اور اردو دونوں کی ملواں
شکل۔ یہ ان کے دور کی دین ہے، دہلی کا مخصوص پس منظر بھی، جس میں کئی بولیاں دہلی پر
اثر انداز ہوئی تھیں۔ ادب کی زبان بننے کا فائدہ مستقبل کے علاوہ حال میں بھی ہوتا ہے

اور وہ یہ کہ زبان کے اثرات ہمہ گیر ہوجاتے ہیں۔ "زبان دہلوی" کے ارتقا میں جہاں بہت سے دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں، وہیں اس کی ادبی شکل بھی ایک ملک گیر اثرات کا سبب بنی ہے چنانچہ خسرو کے بعد کئی دوسرے صوفیوں اور سنتوں نے اپنی مادری بولی علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ "زبان دہلوی" کو بھی اختیار کیا۔ ان میں نام دیو، کبیر داس، اور گرو نانک چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدی میں علی الترتیب آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اس میں شاید اور ترقی ہی ہوتی اگر مغلوں کی فارسی نوازی اردو کی ترقی میں حائل نہ ہوجاتی۔ تغلقوں، سودیوں اور پٹھانوں کے عہد میں اردو یا زبان دہلوی کی ترقی پذیرائی ہوتی رہی مگر شاید سیاسی حالات کی شکست و ریخت کے سبب "زبان دہلوی" کا کوئی ادبی نمونہ سامنے نہ آسکا۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لکھا گیا ہو جسے زمانے نے تلف کردیا ہو۔ اسے تحقیق کی نارسائی بھی کہا جاسکتا ہے اور دست برد زمانہ کی تاویل بھی کی جاسکتی ہے۔ کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ اتنی طویل مدت اور حکومت کی حمایت کے علی الرغم اس زمانے کا کوئی ادبی نمونہ سامنے نہیں ہے جو بہت تعجب خیز ہے۔

لودھیوں کے بعد مغل سریر آرائے سلطنت ہوتے ہیں۔ بابر کی تلوار ہندوستان کو فتح کرتی ہے مگر اس کا قلم زبان دہلوی سے اس وقت شکست کھاتا ہے جب وہ اپنی ترکی شاعری کے ساتھ نئی زبان میں بھی اظہار خیال کرتا ہے،

"مج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی"

ہمایوں کے دربار اور اکبر کی سرکار میں بھی فارسی کے پہلو بہ پہلو زبان ہندوستانی پروان چڑھتی ہے خواہ سرکاری زبان فارسی رہی مگر منڈیوں، بازاروں، گلی کوچوں اور یہاں تک کہ محلات شاہی میں ہندوستانی کا دور دورہ رہا۔ اس زمانے کے ساتھ گر آگرہ میں برج

بھاشا حاوی رہی، دہلی میں کھڑی بولی کا روپ نکھرتا رہا۔ عالمگیر کے عہد حکومت کے ابتدائی ایام میں محمد افضل جھنجھانوی اور آخری ایام میں میر جعفر زٹلی کے نام بہت اہم ہیں۔ خسرو، نام دیو، کبیر، نانک اور ان جیسے صوفیاء اور سنتوں کے کلام نیز محمد افضل اور میر جعفر کی شاعری سے واضح ہوجاتا ہے کہ کھڑی بولی ایک جداگانہ اور انفرادی شان اور آن بان کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ادب کی زبان بن رہی تھی۔ خام حالت میں مسلمان لشکری اسے اپنے ساتھ دکن لے گئے جہاں وہ زبانوں کے اجنبی ماحول میں پرورش پاتی رہی مگر شمال میں بھی اس کا ترقی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا بلکہ شمال میں لسانی ترقی کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز رہی۔

سیاسی بالیسیوں نے اسے کبھی کبھی دبایا اور پیچھے بھی دھکیلا تاہم اس سے بھی اسکی ترقی کی رفتار سست نہیں پڑی۔ سترھویں صدی کے اواخر میں یہ زبان اپنی ابتدائی حالت سے نکل کر معیاری زبان کے زینے تک پہنچ گئی۔ چنانچہ جب ۱۷۰۰ء میں ولی دکنی زبان بولتے ہوئے دہلی آئے تو انھیں ایک ترقی یافتہ زبان سے سابقہ پڑا۔ انھیں ان کی ناپختگیوں اور نارسائیوں کی طرف کچھ تو صوفی سعد اللہ گلشن نے توجہ دلائی کچھ خود ان کو بھی احساس ہوا ہوگا۔ یوں شروع میں شمال اور جنوب کی زبان میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا تاہم زبان کو صاف و شستہ بنانے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ جب ولی دوبارہ دکن سے دہلی آئے تو ایک جگ بیت چکا تھا ایک دوسری اور نئی نسل پروان چڑھ کر میدان شاعری میں اتر آئی تھی بائیس سال کے عرصہ میں دہلی کے زمین و آسمان بدل گئے تھے۔ فارسی شاعری کے چاند اور سورج مرزا بیدل اور خان آرزو ریختہ گوئی پر اتر آئے تھے۔ ایک پوری کھیپ اردو شاعروں کی تیار ہوگئی

تھی۔ طبیعتوں کی جھجک نکل چکی تھی۔ جنھیں ریختہ سے عار تھا وہ ریختہ کی ٹیپ سے ٹیپ ملانے کی جستجو کر رہے تھے۔ نواب فائز دہلوی کا دیوان ولی کے دیوان سے سات سال پہلے ۱۷۱۵ء[1] میں سامنے آگیا تھا۔ اسی عرصہ میں ایہام گو شعراء کی ایک پوری نسل لہلہانے لگتی ہے۔ آبرو، شاکر ناجی، احسن اللہ احسن، یک رنگ وغیرہ بے شمار نام ہیں جنکی شاعری میں الفاظ نازک کی تلاش سب سے نمایاں چیز ہے۔ یہ گویا بولی ٹھولی کے ادبی شکل اختیار کرنے کا اوج کمال تھا اور یہیں سے وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جب کچھ زبان و ادب کے مصلح کھڑے ہوتے ہیں جنھیں قواعد نویس کہا جاتا ہے وہ دراصل زبان کے بگاڑ کو بنانے سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں اردو میں بھی یہ مرحلہ آیا تو ایہام گو شعرا ہی کے سلسلے سے ایہام گو شاعروں نے اسکی اصلاح کا بیڑا اٹھایا یہ تھے مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم انھیں ایہام گوئی سے اباحت محسوس ہوئی دونوں نے ایہام گوئی ترک کی شاہ حاتم نے تو یہاں تک کیا کہ اپنا ضخیم دیوان کاٹ چھانٹ کر ہلکا کیا اور "دیوان زادہ" کے نام سے شائع کرایا اس کے بعد زبان کو وسعت دینے کے لیے کچھ اصول بنائے یہی دہلی میں اصلاح زبان کی تحریک کہلاتی ہے۔

شاہ محمد حاتم کو اصلاح زبان کا بہت شدید احساس تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایہام گوئی ترک کی۔ اپنے کلام کا بہت بڑا حصہ خود تلف کیا۔ دیوان زادہ ترتیب دیتے ہوئے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"زبان ہندی بھاشا کو چھوڑ دیا۔ روزمرہ جو عام فہم اور خواص پسند ہے اسے اختیار کیا۔ وہ الفاظ جو قابل قبول نہیں شلاً عربی و فارسی کے تتبیع (تتبی) صحیح (ہی) بیگانہ (بگانہ) دیوانہ (دوانہ) کی بگڑی ہوئی شکلوں (جو قوسین میں ہیں) کو

ترک کر دیا۔ ہندی کے الفاظ نیتں، جگ، نت وغیرہ کو بھی ترک کر دیا اسی طرح ستی کے بجائے "سے" اور اودھر کی جگہ اُدھر، کیدھر کے بجائے کدھر کو اختیار کیا گیا یہی جگہ پر یاں، واں، کی جگہ یہاں، وہاں کو فصیح قرار دیا گیا وغیرہ یہ اسی عبارت کا مفہوم ہے جو شاہ حاتم نے اصلاح زبان کی خاطر اپنے فارسی دیباچہ میں لکھی۔

اردو زبان کی ان اصلاحی کوششوں کے دو رخ نمایاں تھے۔

۱۔ یہ کیا ہونا چاہیے   ۲۔ یہ کیا نہیں ہونا چاہیے۔

پہلے رخ کے مطابق زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا خیال ان سب کے پیش نظر تھا زبان کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے انھوں نے فارسی محاوروں، ترکیبوں اور اصطلاحوں کا ترجمہ کیا۔ موضوعات کی گوناگونی اصناف شعری کی بوقلمونی طبیعتوں کی رنگا رنگی نے زیادہ سے زیادہ الفاظ کی طلب کی۔ اپنی زبان کا مروجہ ظرف بہت ہی محدود نظر آیا اس لیے عربی و فارسی کے سڈول اور الفاظ کی کھپت کی صورتیں پیدا کی گئیں شلاً مصادر میں

برآمدن سے بر آنا	جگہ کردن سے جگہ کرنا
خوش آمدن سے خوش آنا	عرق عرق شدن سے عرق عرق ہونا
درآمدن سے در آنا	آب آب شدن سے آب آب ہونا
بہم رسیدن سے بہم پہنچنا	زندگی کردن سے زندگی کرنا۔ وغیرہ

بے شمار صورتیں اردو میں آگئیں۔

عربی و فارسی مرکبات کا استعمال جائز کیا گیا۔ شلاً تر دامنی، چراغ سحری پنبہ دہنی، آتش دلربا، دامن کوہ، گردن مینا، دست صبو، قافلہ، نکہت گل،

---

[1] دلی کا دبستان شاعری از پروفیسر نور الحسن ہاشمی طبع ۴۹ء صفحہ ۱۲

غبارِ ناتواں، حلقہ در گوش، حرفِ زیرِ لبی، صحرا صحرا وحشت، خانہ بر انداز چمن، طوفان بدوش، دامن کشیدہ، آفت رسیدہ، گریباں دریدہ، ذوی الاحترام، مالایخل نوبہ یوم الحساب، مستغنی الاحوال، دار الغناء وغیرہ۔

بعض پورے پورے فارسی مصرعے یا فقرے جوں کے توں زبان میں داخل کیے گئے مثلاً قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں، سر بہ پیش افگندہ، قدر سفت آسماں، ظلم شعار وغیرہ
عربی و فارسی اسماء میں ہندی مصادر لگا کر نئے الفاظ تراش لیے گئے، مثلاً عمل کرنا، تولد پانا، نشو و نما دینا، التماس کرنا، اشتہار کرنا، تصور کرنا، خط باندھنا، منت کھینچنا، عیب لگنا، خوش ہونا وغیرہ

وہ عربی و فارسی اسماء کے آخر میں (ی) لگا کر صفت بنا لیتے تھے۔ مثلاً حیرتی، سنوی، تلاشی، ایک لفظ فارسی ایک ہندی ملا کر صفت یا اسم بنا لیتے تھے مثلاً شریر بچن، نیک چلن، موٹھ زرد، بھالا بردار وغیرہ۔ اس نے کی جگہ اُن نے، کس نے کی جگہ کن نے، وہ کی جمع وے، میرا ترا کی جگہ مجھ، تجھ، علامت فاعل، نے کے استعمال میں بے قاعدگیاں روا رکھی گئیں۔ جمع بنانے میں "ان" کا اضافہ کرتے تھے اس طرح یہ تمام مروجہ شکلیں جو دکنی یا برج یا ہریانی کے زیر اثر دلی کی اردو میں پہلے سے موجود تھیں ان کو برقرار رکھا گیا اور ان سب کی ایک کسوٹی مقرر کی گئی کہ غلط العام فصیح ہے۔

ترکیبِ اضافی میں اگر ایک لفظ ہندی کا بھی ہوتا تو بھی فارسی اضافت لگانے میں باک نہ کرتے، مثلاً بیرِ مٹھیان، پوششِ چھینٹ، مانندِ آرسی، حنائے ارتھی وغیرہ۔ انھوں نے زبان کو وسعت دینے کی خاطر، قواعد کی بے جا پابندی

اور پاس داری نہیں کی۔ وہ ہندی اور فارسی الفاظ کو بعض اوقات تخفیف سے بھی باندھتے تھے۔ وہ ضرورتِ شعری کے مطابق لفظ کے حروف میں اضافہ روا رکھتے تھے۔ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن، مخفف کو مشدد اور مشدد کو مخفف کر دینے میں بھی انھیں کوئی تردد نہ تھا۔ وزن کو پورا کرنے کے لیے وہ عربی و فارسی الفاظ کو بعض جگہ بگاڑ کر بھی استعمال کر لیتے تھے۔ ثقیل اور غیر ثقیل کی کوئی قید انھوں نے نہیں لگائی۔ حتی کہ متروکات کو بھی وہ دوبارہ سے استعمال کر لیتے تھے ان کے سامنے الفاظ بیان میں وسعت اصل اصول تھا۔ یہ گویا انقلاب آفریں اقدام تھا جو ان لوگوں نے جان بوجھ کر اپنی تحریروں میں برتا۔ دوسروں کو برتنے کی تلقین کی۔ مگر ان کی تلقین کا دائرہ بڑی حکمت پر تھا انھوں نے زبان کو سنوارنے کے لیے کوئی مصنوعی انداز اختیار نہیں کیا۔ اِسی لیے ان کی اس تحریک کے بہت عمدہ نتائج برآمد ہوئے۔ طبیعتوں میں ضد یا ہٹ دھرمی جڑ نہیں پکڑ سکی بلکہ لوگوں نے آزادانہ اس اصلاح کو قبول کیا جس میں اصولوں کی پیروی کے باوصف سختی سے پابندی کا عیب نہیں تھا۔ انھوں نے لغات کی سخت گیرانہ پابندی کے بجائے کھلی چھوٹ دے دی کہ جس زبان کا جو لفظ مل جائے اس کو بلا تامل باندھ لیا جائے۔

اس دور کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ دلی والوں نے عام بول چال کی زبان کو بہت رواج دیا۔ میر تقی میر کو جو اس دور کے نوجوان شاعر تھے ان کا بڑا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنے قیامِ لکھنؤ میں اہلِ لکھنؤ کے اصرار پر بھی کسی بھی محفل میں اپنا کلام نہیں سنایا اور مصر ہونے والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بے شک آپ لوگ انوری اور خاقانی کا کلام سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان کی شرحیں

چھپ چکی ہیں، مگر میرا کلام سمجھنے کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ بولی جانے والی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ وہ مسجد کو مسیت قرآن کو قرآن جلید کو جلیت نزدیکیا کو نزدیک باندھتے تھے کہ یہی روزمرہ دہلی کا محاورہ تھا۔

اس کے بعد انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں یہ صراحت کر دی کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ اردو کا لفظ ہے "یعنی جو لفظ اردو میں جس طرح استعمال ہونے لگا اردو میں صحیح مانا جائے گا وہ چاہے از روئے اصل کسی طرح بھی استعمال ہوتا ہو زبان کے فروغ کے لیے اس اصول کی اختراع بڑے ہی دور رس نتائج اور دیرپا اثرات کی حامل ہوئی۔ بعد کے ادوار میں اسی اصول کو اردو کے اکثر شعراء نے اختیار کیا اور اردو زبان کی برتری کا لوہا بھی منوایا۔ آتش نے اسی اصول کی پیروی میں بیگم کو بیگم باندھا اور معترض کا ہمیشہ کے لیے منھ بند کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں جتنی کچھ زبان میں وسعت اور ہمواری آئی وہ کسی دور میں نہیں آئی۔ یہ لوگ قواعد کی پابندی ضرور کرتے تھے۔ عربی فارسی ماخذ سے بھی بیگانہ محض یا نا آشنا نہیں تھے ان پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ اصلاح کی کوشش بھی کیا کرتے تھے مگر ان کی اصلاحی کاوشوں کا انداز معاندانہ اور جارحانہ نہیں تھا، بلکہ بہت ہی مثبت اور صحت مند انداز تھا۔ ان کے اصول بہت سخت نہیں تھے کہ ان سے روانی کا خون ہوتا، جو مضمون ان کے خیال میں آتے تھے اسکو سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے تھے الفاظ کو بے تکلف باندھتے تھے اصولوں کی لچک سے زبان میں لوچ آ گیا خیال حسب منشا ادا کرنے میں سہولت رہی اس کے نتیجے میں شعر و شاعری کا بڑا چرچہ ہوا۔

اور ایک مختصر سی مدت میں شاعروں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔

اصلاحِ زبان کی اس تحریک سے اردو کی ایک اور بڑی خدمت یہ ہوئی کہ اس نے اردو کے مزاج کا صحیح معنوں میں ساتھ دیا۔ دکنی میں خاصا پراناپن موجود تھا اور دیسی عناصر کی بھی بھرمار تھی۔ دیسی عناصر کی موجودگی کے اچھے اور برے دونوں نتائج تھے اچھا رواج یہ تھا کہ انکے کلام میں اپنی مٹی کی بو باس تھی مگر اسکے ساتھ ہی خیال کی بے جا تکرار کا عیب تھا بیان میں عجز تعقلی میں ان عناصر کے خلاف ردِ عمل مرزا اور شاہ حاتم کی اس تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تحریک کا بڑا مقصد یہ تھا کہ دکنی اور ہندی گیت اور دوہوں کے اثرات کو اعتدال پر لایا جائے، ایہام گوئی جو برج بھاشا کے اثرات کا نتیجہ بھی تھی اسے موقوف کیا جائے، موضوعات میں تنوع خیالات میں ندرت اور طرزِ ادا میں جدت آئی دکنی زبان و بیان سے طبیعتیں نالاں تھیں اور آخر میں تو لوگ کھل کر اسکی مخالفت کرنے لگے تھے۔ قائم چاندپوری کا یہ شعر اسی مخالفت کا اشارہ ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

ایہام گوئی سے نفرت سودا کے اس شعر سے ٹپکتی ہے ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

میر کو بھی دکنی زبان کے عیب نظر آئے تھے جنہیں انھوں نے اپنے ہنر سے بدل دیا تھا ؎

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک برگ و بار لانے لگی۔ حاتم کا سکون ان اشعار میں دیدنی ہے ؎

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

یا

ان دنوں سب کو ہوئی ہے صاف گوئی کی تلاش
نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا

اس طرح یہ تحریک اپنے مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو گئی اسکے علم برداروں کو ان کے جیتے جی اپنی کاوشیں کامیابی سے ہم دوش و ہم آغوش نظر آئیں۔ اہل دہلی نے دیسی الفاظ کو زبان کا جزو قرار دیا، لیکن ان کا یہ طرزِ عمل بے تکا یا اندھا دھند نہیں تھا۔ اردو کا فطری مزاج دیسی بدیسی عناصر میں ایک حسین توازن کا جویا ہے۔ اہل تحریک نے اس ضرورت کو خوبی پورا کیا۔ یہ تحریک ان ایہام گو شعراء کی بغاوت سے شروع ہوئی جن میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم کے نام سرِ فہرست آتے ہیں اس میں مرزا رفیع 'سودا' میر تقی میر اور سید انشاء اللہ خاں انشاء نے شعوری اور غیر شعوری طور پر زبان کی اصلاح کے لیے زبردست کام کیے ان میں شروع کے لوگوں نے کچھ قواعد بنائے آنے والوں نے ان کی پابندی کی ان سب نے مل کر اپنے قول و عمل سے اس تحریک کو برپا کیا، جسے ہم دلی میں اصلاحِ زبان کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔

— · —

لکھنؤ کی اردو اور ناسخ کی تحریکِ اصلاحِ زبان

گزشتہ صفحات میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ ادب کی زبان بننے کے بعد زبان کی اپیل ہمہ گیر اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اسکی ترقی کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جب اردو شمال میں اپنی انتہائی ترقی کو چھونے لگی دکن اور شمال کے فاصلے شروع میں کم اور بعد میں ختم ہو گئے۔ ایک قلیل مدت میں شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد وجود میں آ گئی ان کے نام کے ساتھ ان کا کلام بھی روشناسِ خلق ہونے لگا۔ دل سے نکل کر انکی آوازیں مضافاتِ دلی اور پھر ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچنے لگیں اسکے بعد معاشرتی اور سیاسی حالات اور اقتصادی تقاضوں نے بھی ان کا دلی میں رہنا دوبھر کر دیا۔ دلی اجڑنے لگی نادر شاہ کے قتلِ عام اور ابدالیوں کے حملوں نے تیموری خاندان کے عز و وقار کو ہی نیست و نابود نہیں کیا دلی کے باشندوں کو بھی غیر یقینی حالات میں مبتلا کر دیا۔ اندرونی قزاقوں، مرہٹوں اور روہیلوں کی قتل و غارت گری نے رہا سہا سکون بھی چھین لیا۔ لوگ گھروں سے نکلنے کو ایک مصیبت سمجھنے لگے ان حالات میں ادبی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ دلوں کے ولولے اور طبیعتوں کے ابھار ختم ہونے لگے۔ طوطی کی طرح چہکنے والی آوازیں خاموش ہو گئیں کچھ دنوں تک تو اردو کے وہ شعراء جو دلی میں تھے چپ سادھ کے بیٹھ گئے تاہم طبیعتوں پر کب تک بند باندھے رہتے دوسری طرف معاشی تقاضے بری طرح ستانے لگے ان خراب و خستہ حالات میں باکمالوں کی نگاہیں ملک کے مختلف حصوں کو ٹٹولنے لگیں تھیں دلوں

لکھنؤ میں شجاع الدولہ نے ادب و شعر کی ایسی محفل سجائی جو ایک طرف باکمالوں کے معاش کا مسئلہ حل کرتی تھی اور دوسری طرف ان کے ذوق و شوق کی پذیرائی بھی کرتی تھی۔

دہلی کی پے بہ پے آفتوں سے تنگ آکر بہت سے شعرائے دہلی فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ گئے در اصل ان شعراء کی آمد لکھنؤ سے پہلے وہاں کوئی بڑا مقامی شاعر موجود نہیں تھا اس طرح سے دہلی کی تخریب لکھنؤ کی تعمیر کا سبب بن گئی۔

زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ذوق و زبان میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں شعر و ادب کی زبان و بیان اور اسکے موضوعات میں تغیر بھی لازمی ٹھہرا۔ دہلی کی تہذیب میں ابھی تک صوفیانہ انداز کا عمل دخل تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کی بنیاد ہی کچھ جداگانہ عناصر پر رکھی گئی۔ لکھنؤ میں خوشی مسرت اور عیش و عشرت کی فراوانی تھی اس لیے کہ روپیے کی افراط تھی یہ ایک نو دولتیہ ریاست تھی اسکی دوست کے پیمانے چھلکے پڑتے تھے شجاع الدولہ کی عیاشی کا مرقع فیض بخش کاکوروی نے کھینچا ہے جس کا نقطۂ نظر عروج پہ ہے "انھیں فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ کوئی محلہ کوئی کوچہ گانے والی اور بازاری عورتوں سے خالی نہ تھا۔ گویا اس حمام میں سب ننگے تھے۔"

جیسا راجہ ویسی پرجا کے مصداق عام ذہن عیش و عشرت کے ماحول میں پروان چڑھ رہے تھے شاعری کے جنون نے امراء و روساء کو آرام طلب بنا دیا تھا۔ شاعروں کی محفلیں ماہوار و ہفتہ وارے گزر کر روزانہ جمنے لگی تھیں۔ شوق کی یہ فراوانی تھی جس نے لکھنؤ میں ایسے دبستان کی بنیاد رکھی جس کی نوعیت میں کوئی اہم اصولی فرق نہ ہونے کے باوجود رجحان طبع، ذہنی رویے اور اسالیب بیان کا نمایاں فرق ہے۔ در اصل یہ پرانی ڈگر سے ایک قسم کی بغاوت تھی۔ طبیعتوں کو کھل کھیلنے کے

نئے مواقع میسر آئے تھے۔

لکھنؤ میں شعر و ادب کی نئی بساط بچھی تو ضاحک کے لڑکے میر حسن اور ان کے پوتے میر مستحسن خلیق دہلی سے لکھنؤ آ گئے ان کے علاوہ میر، سودا، سوز اور خان آرزو آئے اس کے بعد جب پرانے شعرا کا سہرا ختم ہوا تو ایک نئی پود اٹھی ان میں انشاء، مصحفی، جرأت اور رنگین کے نام قابل ذکر ہیں۔ انشاء کے مطابق خود لکھنؤ دوسری دہلی بن گیا۔

اس وقت لکھنؤ کا سرمایۂ زبان و ادب لب کم تر اور قلیل تھا آنے والے دہلی کا محاورہ بھی ساتھ لائے۔ رفتہ رفتہ خود لکھنؤ میں زبان و ادب اس قابل ہو گئے کہ انکا اپنا جداگانہ محاورہ روزمرہ پیدا ہو گیا اسکی اصلاح بھی شروع ہوئی یہ کام حجابانِ لکھنؤ نے سرانجام دیا۔ لکھنؤ میں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑ گئی ہر خطے کی اپنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جو سماجی، سیاسی، معاشی حالات سے متاثر ہوتی ہیں، چنانچہ لکھنؤ میں دہلی کی بہت سی ابھری ہوئی خصوصیات دب گئیں اور دہلی کی بہت سی دبی ہوئی خصوصیات ابھر آئیں۔ لکھنؤ میں جذبات کی پاکیزگی، زبان و بیان کی سادگی اور متانت پر زور دینے کے بجائے سجاوٹ اور بناوٹ پر زور دیا جانے لگا۔ یہاں کیف و مستی کھلی رنگ و رامش کی محفلیں سجتی تھیں۔ اسی لیے یہاں کی شاعری اور ادب میں اس کا قدم قدم پر انعکاس ملتا ہے۔ طبیعتیں نہ صرف بے باک ہو گئیں اس لیے کہ اخلاق و ادب کے بندھ ڈھیلے پڑ گئے تھے بلکہ معاملہ بندی سے گزر کر فحاشی اور ابتذال تک جا پہنچی۔

لکھنؤ کے شعر و ادب کی کچھ خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

عالمانہ زبان کا استعمال علمیت کا مظاہرہ:- دہلی میں سارا زور سادگی پر تھا۔ لکھنؤ میں تمام تر توجہ رنگینی پر صرف ہونے لگی۔ دہلی میں جذبات اور تصویر کشی سادے

گرگرا انداز میں کی جاتی تھی۔ تخئیل اور محاکات کو کسی قیمت پر بھی لفظی شعبدہ گری پر قربان نہیں کیا جاتا تھا۔ جبکہ لکھنوی شعرا نے اپنی علمیت اور زبان دانی کے جوہر دکھانے کے لیے زبان و بیان کے نئے نئے بیشتر ایجاد کیے۔ اپنی تمام تر توجہ کسی ذاتی تجربے کی تجسیم کے بجائے شعر کے حسن ظاہری، رعایت لفظی، ضلع جگت، صفت گری اور صفتوں کے التزام پر رکھی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی

زبان کی اس بازی گری نے تاثر کا خون کر دیا۔ سادگی، برجستگی اور بے تکلفی کی جگہ تکلف، تصنع اور بناوٹ نے لے لی۔

تشبیہات و استعارات کی فراوانی: تشبیہ کلام کا ایسا زیور ہے جس سے اس کا حسن نکھر آتا ہے مگر اس دور میں اس حس و لطافت کے ساتھ بھی برتاؤ کیا گیا سادہ اور فطری تشبیہوں کی جگہ تشبیہ در تشبیہ یا پھر تشبیہات کے اجزا کی تحلیل اور تجزیے پر زور دیا گیا وہی لوگ جو حسین ترین تشبیہیں پیش کرتے آئے تھے تشبیہات کے چکر میں پھنس کر کلام کو بے مزہ بنانے کا باعث بن گئے۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

(یا) ؎ دو سانپ گھٹ گئے تھے زبانیں نکال کے

یا یہ نوبت پہنچی ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

عربی و فارسی تراکیب و اصطلاحات کی گرم بازاری: عربی و فارسی کی نامانوس، ادق اور بھاری بھرکم اصطلاحوں اور تراکیب کو اپنی علمیت کے زعم میں لکھنؤ کے شعرا نے باندھنا اپنا معمول بنایا تھا۔ وہ چیزیں جنھیں متقدمین نے رفتہ رفتہ ترک کر کے زبان کو سہل اور سڈول بنایا تھا، لکھنوی شاعری میں پھر سے بار پا گئیں ہندی تراکیب، محاورے، ضرب الامثال جنھیں میر، سودا وغیرہ نے اپنی شاعری میں اختیار کیا تھا اور حسن بیان کو ایک طرح سے ناز تھا۔ لکھنؤ میں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جا سکی بلکہ اصلاح زبان کے طلسم میں پھنس کر زبان پر جراحی کا عمل کیا گیا۔

معاملہ بندی اور ابتذال: اگرچہ معاملہ بندی کوئی نئی چیز نہیں تھی جسے لکھنؤ نے شروع کیا بلکہ اس کی قدیم روایت فارسی میں موجود تھی اُسے اردو شاعری میں باقاعدگی کے ساتھ جرأت نے استعمال کیا۔ لکھنوی شعرا میں سے بیشتر کا کلام معاملہ بندی کا ایک دفتر ہے اس کی ایک قدر و قیمت بھی ہے مگر اس کا وہ پہلو جہاں سے رکاکت اور ابتذال شروع ہو جاتے ہیں ناقابل التفات ہے اس کی مثال ملاحظہ ہو ؎

دوپٹہ کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

(یا)

کھیلتا ہے وہ کبڈی میں بھی کھیلیں جان پر
ہاتھ رکھ دوں گی میں ہے قاتل کی ننگی ران پر

زبان وبیان میں مشکل پسندی بھی اس معاشرے کی دین ہے جس سے شعرائے لکھنؤ اس دور میں گزر رہے تھے۔ وہاں شخصیت پر ملمع تھا تو شعر کس مصنوعی پن سے عاری رہتا۔ خیال میں رفعت و بلندی نہیں تھی۔ فکر بے تہہ اور اتھلی تھی اور اتھلے برتنے ہی زیادہ چھلکا کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی ہمہ دانی کا احساس جیسے بدل کر ظاہر ہوتا تھا۔ کبھی علمیت بگھارنے کے لیے بھاری بھرکم اصطلاحوں اور ناتراشیدہ تراکیب کا سہارا لیتے، کبھی طویل بحروں، سنگلاخ زمینوں، بے روح قوافی اور ردیفوں میں شاعری کرتے۔ شعر پر شعر نہلے پہ دہلے کے مصداق ہوتے۔ ایک غزل سے سیری نہ ہوتی تو دوغزلہ سہ غزلہ کہلاتے اور اپنی دھاک بٹھانے اور زبان دانی کے جوہر دکھانے کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھیڑ دیتے۔ اسی کو مولوی عبدالسلام ندوی نے لندھور بن سعدان کی داستان سے تعبیر کیا ہے۔ وہ خیال پر آرائش زبان کو ترجیح دیتے۔ مترادفات کی فراوانی ان کے کھرے کو بھی کھوٹا بنادیتی ہے۔ یہ چیز شاعری تک محدود نہ تھی۔ ان کی نثر بھی مرصع، مرجز، مقفیٰ ہوتی۔ صنعتوں اور صفتوں کا التزام ہوتا۔ چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب اور نواب واجد علی شاہ کی بیگمات کے مکاتیب جو لکھنؤ کے آخری دور میں لکھے گئے اسی کلو بیچارہ گوئی اور ہرزہ سرائی سے لبریز ہیں۔

ان کی شاعری اور ادب میں داخلی پہلو دب گیا۔ خارجی پہلو اس قدر ابھرا کہ آخر آخر اس میں جرأت اور امانت کی چوما چاٹی اور رجان صاحب کی توڑا مروڑی اور انگیا کرتی کی شاعری رہ گئی۔ آخر میں لکھنؤ کا یہ شعر و ادب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوا جب خود اس کے حامیوں نے اس سے نفرت کی اور اس کی اصلاح کی تدبیریں ڈھونڈنی

شروع کیں۔ جس طرح ایہام گو شعراء کی اصلاح کے لیے ایہام گو شعرا حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے اسکی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اسی طرح لکھنؤ میں ناسخ نے اپنے زمانے کی تمام مروجہ شرلیعتوں کو منسوخ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا ان کے شاگردوں کی فوج ظفر موج ہر چار سو بکھری تھی اور ناسخ کی اصلاحوں کو بزور منواتی تھی جس طرح میر نے دعویٰ کیا تھا ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔

اور لوگ ان کے اس دعوے کے مطابق خاصی حد تک میر سے رجوع کرتے رہے مگر ناسخ نے اپنے بارے میں ایسا حکم نہیں لگایا لیکن اس کے باوجود ناسخ کا "فرمایا ہوا" ان کے عہد میں اور بعد میں بھی بڑی حد تک قابلِ قبول سمجھا گیا۔

ناسخ کی اصلاحی کوششیں:۔ سب سے پہلے ناسخ نے زبان کا نام اردو مستند قرار دیا۔ اس کے علاوہ اردو کے جتنے نام رہ چکے تھے اور جو چلے آرہے تھے مثلاً ہندوی، ہندوستانی زبان، ہندوستان، دہلوی یا لاہوری، ریختہ یا اردوئے معلیٰ اور دکنی ان سب کی جگہ ناسخ نے یہ اصول طے کر دیا کہ آئندہ صرف ایک نام اردو ہوگا۔ ہر دوسرا نام متروک سمجھا جائیگا۔

حروف میں اصلاح:۔ ناسخ نے حروفِ ربط کو اردو غزل کی زمینوں میں استعمال کیا اور ردیف کی بنیاد حروفِ ربط یعنی کا، کی، کے، کو، سے نے، پر، اور تک وغیرہ پر رکھی۔

حروفِ اثبات و نفی کا استعمال:۔ ہے اور نہیں کو بھی شاعری میں استعمال کیا جانے لگا۔ نئی زمینوں کے بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہو اور نہیں کا استعمال بھی ؎

سب زمینیں ہیں نئی بستیں نہیں اے یار نئی
روز یہاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی

مصادر میں تبدیلی:۔ جو مصادر صحیح تھے ناسخ نے صرف انھیں کے استعمال کی اجازت روا رکھی ہے وہ مصادر جو اصولاً غلط تھے جنھیں بعض شعرا نے اپنی آسانی کے سبب گھڑ لیا تھا انھیں متروک قرار دیا گیا مثال کے طور پر مجبور کا شعر ہے ؎

باتیں دیکھ زمانے کی جی باتوں میں بہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

افعال میں ترمیم:۔ بہت سے مروجہ افعال جو از روئے اصول غلط تھے انکا بدل ناسخ نے قائم کیا۔

مثلاً مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل
بدلہ کرنا	بدلہ لینا	جھکے ہے	جھکتا ہے	لگے ہے	لگتا ہے
لاکا	لگا	کوہ چیرا	کوہ پھاڑا	کہے ہیں	کہتے ہیں
آئے ہے	آتا ہے	جائے ہے	جاتا ہے	کھائے جائے ہے	کھاتا ہے

مثلاً شعر ہے ؎

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل
کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

یا مومن کا مصرعہ ہے ع کس کے استقبال کو جی میرا تن سے جائے ہے

ہندی اور بھاشا کے الفاظ کا ترک:۔ ناسخ نے ہندی اور بھاشا کے الفاظ کو ترک کر کے ان کی جگہ فارسی الفاظ اور عربی الفاظ و اصطلاحات کو زیادہ استعمال کیا مثلاً تک اور تنک کی جگہ ذرا بن کی جگہ بغیر دوانہ کے بجائے دیوانہ یوں کے بجائے سوا ماٹی کی جگہ مٹی کو معیاری قرار دیا گیا۔

ضمائر میں تبدیلی:۔ فارسی عربی اور ہندی زبان کے جو ضمائر اردو میں مستعمل تھے ان میں بعض کو بالکل ترک کرنے کا حکم دیا گیا اور بعض میں تبدیلی کر کے ان کا استعمال روا رکھا گیا۔ مثلاً اس نے سے اُن نے تزسے یا تجھ کو سے تجھ جس نے سے جن نے تو سے تئیں۔

تذکیر و تانیث:۔ ناسخ کے زمانے تک تذکیر و تانیث کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں تھا لیکن اسکے بعد انھوں نے اسکے بھی قاعدے مقرر کیے مثلاً زخمیں (مونث) زخم (مذکر) وہ چیز جدی ہے کہنے کے بجائے "وہ چیز جدا ہے" وغیرہ کہنے پر زور دیا۔

واحد کے صیغے: جمع بنانے کا دکنی قاعدہ ان کے بجائے "یں" بنایا گیا۔ پہلے عورت کی جمع عورتاں، بات کی جمع باتاں مستعمل تھا۔ ناسخ نے عورتیں اور باتیں کو مستند قرار دیا۔

محاورات کی اصلاح:۔ مروجہ محاوروں میں بھی اصلاح کی گئی قدرے تبدیلی کر کے ان کی صحیح شکل اختیار کی گئی، مثلاً

مروجہ	اصلاح شدہ	مروجہ	اصلاح شدہ
زور رکھنا	موکھڑ رکھنا	خیال لینا	خیال باندھنا
انتہا لانا	انتہا کو پہنچنا	زنجیر رہنا	قیدی رہنا
پلک مارنا	پلک جھپکنا	دامن جلنا	دامن مسکنا

اس کے علاوہ معشوق اور محبوب کے لیے ہندی لفظ سجن کی جگہ فارسی صنم کو درست قرار دیا گیا۔ قدما بول چال کی زبان کو کلام میں باندھتے تھے اسکے لیے ناسخ نے ایسے الفاظ زبان سے بالکل چھانٹ دیئے چنانچہ صفیر بلگرامی جلوہ خضر میں لکھتے ہیں کہ قدما نے چند باتیں ایسی اختیار کی تھیں کہ جو مضمون ان کے خیال میں آتا تھا اسکے باندھنے میں ان کو تکلف اور توقف نہیں ہوتا، مثلاً حروف ربط کا چھوڑ دینا۔ ہندی یا فارسی الفاظ

کی تخفیف سے باندھنا۔ حروف والفاظ کو بڑھانا یا ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن مشدد کو مشدد مخفف کردینا، الفاظ ہندی کو بگاڑ کر باندھنا جس سے وزن پورا ہو جائے، ثقیل اور غیر ثقیل ہر لفظ کو باندھنا، متروک کو بھی بضرورت استعمال کرلینا کسی لغت کی پابندی نہ کرنا بلکہ بعضوں کو جس زبان کا لفظ مل گیا اسکے باندھنے میں تامل نہ کرنا وغیرہ۔

ناسخ نے زبان وادب کے متعلق نہایت سخت گیرانہ پالیسی اختیار کی۔ انھوں نے سختی سے عمل کرنے کے لیے دوسروں سے بھی کہا اور خود بھی سختی سے ان اصولوں پرکاربند ہوئے۔ ان کے شاگردوں نے سختی سے پابندی کی اور نہایت شد ومد کے ساتھ ان کی دوسروں سے پیروی کرائی بعض لوگوں نے ناسخ پر اعتراضات بھی کیے ہیں کہ انھوں نے قدما کی ایسی تراکیب اور الفاظ بھی متروک قرار دیکر انکا بدل مہیا نہیں کیا۔ دراصل اس میں ناسخ کی کوئی خطا نہیں یہ خود اصلاح کی فطرت ہے کہ وہ ایک ناخوشگوار فریضہ ہے جس کی تکمیل ناسخ نہیں کرسکتے تھے یہ کام ان کے بعد آنے والوں نے پورا کیا۔ انھوں نے جو اصول قائم کیے ان کو ہر زمانے میں اپنی ضرورتوں کے مطابق لوگوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور یہ مرحلہ بھی گو اردو کے ارتقا میں آنا ازبس ضروری تھا۔

علی گڑھ تحریک اور اردو کی توسیع

علی گڑھ یا سرسید تحریک سے مراد وہ تحریک ہے جسکے سرخیل و سالار سرسید احمد خاں تھے۔ جن لوگوں نے انکی ہم نوائی کی یا انکی اقتدا میں اردو زبان و ادب کی توسیعی مہم میں انکا ہاتھ بٹایا ان کے نام اس طرح ہیں۔

مولوی محمد ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی یہ بہت طویل ہے جس میں بے شمار افراد شامل ہیں فرق اتنا ہے کہ اس اردو کی توسیعی مہم میں ان کا نام اور کام مذکورہ فہرست کے بعد آتا ہے ایک ہی وقت میں اردو کے فروغ کیلے اتنے سارے افراد کا جمع ہو جانا ایک زبان ہو کر اپنا حصہ جٹانا اردو کی خوش قسمتی تھی ان سب کی اردو افق ادب پر موجودگی چاندنی رات کا سماں پیش کرتی تھی جس میں یہ تمام ستارے اپنی لپک جھپک دکھا رہے تھے اور سرسید ان میں چودھویں کے چاند کی طرح تاباں و درخشاں تھے ان کی پارہ صفتی اور سیمابی صفتی انہیں کبھی بیلو قرار نہ لینے دیتی تھی ان سب لوگوں کو قوم کے عروج کی فکر تھی زبان و ادب کو انھوں نے اصلاح حال اور اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ بنانا چاہا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کو جو شعر و ادب ورثہ میں ملا اسکی روایت بہت کمزور تھی وہ یک رخا تھا اسمیں زندگی کے محض ایک پہلو یعنی حسن و عشق ہی کو اولیت اور برتری حاصل تھی انکے نزدیک زندگی بہت وسیع اور بے کراں تھی اور ادب اس زندگی کو دقتی

نسل کا سامان بہم پہنچانے کا آلہ ہی نہ تھا بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو سکتا تھا۔ ان کے سامنے صنعتی انقلاب اور اسکی برکتیں بھی تھیں ان کے پیش نظر مغربی تہذیب کی آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنی بھی تھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی خود ان سب کی نگاہیں بھی خیرہ ہو گئی ہیں اسکے باوجود بھی وہ اسکے سحر سے آزاد رہے اور دوسروں کو اسکے طلسم سے نکالنے اور اپنی دنیا آپ بنانے کی فکر کرتے اور کراتے رہے۔

ادب کے جمالیاتی پہلو سے زیادہ انھوں نے اس کے مادی پہلو کو دیکھا ادب میں افادیت کے سبب علمبردار تھے افادیت کے اعتبار سے یہ کسی مجموعے یا انتشار فکر و نظر کا شکار نہیں تھے۔ یہ زندگی کی وحدت یا اکائی کے قائل تھے زندگی کے مختلف شعبوں میں کاس ہم آہنگی کے جویا تھے ان کی نظروں نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ پرانے سرمایہ شعر و ادب کی ایک بڑی کمی یہی ہے کہ اس میں زندگی خانوں میں جتنی ہوئی، پٹی پسی اور کچلی ہوئی نظر آتی ہے زندگی کو توانا بنانے کے لیے صحت مند اقدار کے حامل اور انھیں کے مبلغ تھے انکے ابلاغ و ترسیل سے ادب کا جمالیاتی پہلو دب گیا ہے اس انداز نظر سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی فائدہ یہ ہوا کہ شعر و ادب کے فنون مفیدہ بننے سے اس کا دائرہ کار وسیع ہو گیا زبان کو نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب ہاتھ آئے، نئی ضرورتوں کی صبح نکلی تو نئی باتیں عام ہونے لگیں اور ادب نئے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن گیا۔ ادب حقیقت سے قریب ہو گیا۔ اس کی اپیل ہمہ گیر اور اس کا دائرہ کار وسیع ہو گیا۔ اسی میں خواب گیں ابہام کے بجائے حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا برتا آ گیا۔ روزمرہ کے مسائل کو حل کرنے کی قوت پیدا ہوئی، نئے سماجی علوم، نئے سیاسی مسائل اور نئے معاشی تقاضوں کو سمجھنے کی راہ باز ہوئی۔

سرسید کی تحریک سے پہلے اردو ادب کا سرمایہ نثر میں چند داستانیں تھیں جو فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئیں یا اس سے باہر کچھ مکاتیب تھے اسکے علاوہ اخباروں کے اجراء سے کچھ صحافتی نثر تھی ماسٹر رام چندر کے مضامین اور غالب کے مکاتیب تھے درآں حالیکہ شعر و شاعری میں زبردست سرمایہ تھا مگر ان سب میں بھی خاص طور سے غزل میں جو اردو شاعری کی سب سے محبوب و مقبول صنف سخن رہی ہے اسکا دائرہ بہت محدود تھا بعض لوگ اسے دورِ انتشار کی نشانی سمجھتے تھے اسی طرح ہر قسم کی بے راہ روی آزادہ روی کے نام سے اس میں راہ پا گئی تھی۔

حالی اور شبلی نے اسکی ماہیت میں تبدیلی کی کوشش کی اسکا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر قرار دیا۔ خود غزلیں لکھ کر یہ دکھایا کہ زندگی کی وسعتیں اس میں سموئی جا سکتی ہیں ان کے سامنے غالب کی غزلوں کا نمونہ جس میں معنی آفرینی تھی اور سوئی ہوئی دماغی توانائیوں کو حرکت میں لاتا تھا۔ افسردگی کی فضاؤں کو جھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی اور جس میں زندگی کو سمجھنے کے لیے ژرف نگاہی تھی۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ایک نئے رخ کا اشاریہ ہے جس میں مروجہ اصولوں سے انحراف بھی ہے اور ان کی اصلاح کی کوشش بھی۔ یہ ایک شدید ضرب تھی جو روایتی شاعری پر اس شخص نے لگائی جو خود بہت روایت پسند تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے حالی سے پہلے موضوعاتی اور نئی نظموں کی انجمن پنجاب کے ذریعے ایک نئی طرح ڈالی۔ غزل تک شاعری محدود تھی۔ انھوں نے شاعری کو حصار سے آزاد کیا نظم پر زور دیا طرحی مشاعروں کے بجائے ایسی محفلیں منعقد کی گئیں جن میں موضوع متعین کیے جاتے، مثلاً ہمدردی، شجاعت وغیرہ۔ لوگ ان موضوعات پر طبع آزمائی کرتے۔ اسطرح شاعری محض فن کی محتاج نہیں رہی، ردیف اور قوافی کا

اہتمام بھی نہیں رہی ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنائی گئی تاکہ لوگوں میں اچھے عادات اور اخلاق پیدا ہوں۔

سرسید اس تحریک کے بانی مبانی تھے۔ وہ ان میں عمر میں بھی سب سے بڑے تھے۔ ان کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو دس بجے انھوں نے علی گڑھ میں انتقال کیا۔ ولادت و وفات کے درمیانی حصے میں انھوں نے ایک بہت ہی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ مسلمانوں کی تیرہ بختی کو خوش بختی میں بدلنے کے لیے انھوں نے پہلے ہی مرحلے میں کنہ کو پا لیا کہ تعلیمی پستی ان کا سب سے بڑا مرض ہے اس لیے اس مرض کو دور کرنے کے لیے انھوں نے تمام عمر مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کی جدوجہد میں لگادی۔

۱۸۵۹ء میں انھوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز فارسی مدرسہ کے قیام سے کیا اسی سال اپنا معرکۃ الآرا مقالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھا۔ ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جو سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان تھا نکالا۔

سرسید نے اپنی تمام توجہ مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو عام کرنے کی طرف لگائی ان کو ان کی عظمت رفتہ اور شوکت پاستاں کی یاد دلائی۔ ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد باہم کی ایک فضا پیدا کرنے کے مواقع تلاش کیے مسلمانوں اور حکومت وقت کے درمیان ہونے والی بدگمانیوں کو دور کیا۔ نثر و ادب میں اصلاح کی زبردست کوششیں کیں۔ اس طرح سرسید نے ایک چومکھی جدوجہد کا آغاز کیا۔

انھوں نے اپنے رسائل کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے وہ آگے بڑھے اور ایک ایسا گروہ بنانے میں کامیاب ہوگئے جنھوں نے اردو زبان و ادب کا مقدر بدل دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا سرسید کی نثر کے لیے یہ احساس بالکل درست ہی ہے کہ "یہ الگ الگ دور کا ادبی سرمایہ ہے۔"[1]

مولوی محمد ذکاء اللہ:۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۲ء دہلی میں ہوئی، ۷ نومبر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ تمام عمر خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ سرسید تحریک کے سرگرم رکن تھے کئی سنجیدہ اور ٹھوس موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں "تقویم اللسان"، "تاریخ ہندوستان" بہت اہم کتابیں ہیں۔ ذکاء اللہ کی تحریروں میں ادبی شان سے زیادہ مدعا نگاری کا عمل دخل ملتا ہے۔

مولوی چراغ علی:۔ کشمیر الاصل تھے ان کے والد نے میرٹھ کی سکونت اختیار کی شروع میں محرر رہ گئے بعد میں حیدرآباد جاکر ترقی کے مدارج طے کرنے لگے انکی انگریزی دانی کی ایک دنیا قائل ہے جدید عالم اور ماہر لسان تھے انھوں نے اسلام کی دفاع میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ضخیم کتابوں کے نام اس طرح ہیں۔ تحقیق الجہاد، اعظم الکلام فی ارتقاء اسلام، محمد پیغمبر، تعلیقات (اردو) اسلام کی دنیوی برکتیں، قدیم قوموں کی مختصر تاریخ، رسائل چراغ علی۔ یہ سب ان کی گراں مایہ تصانیف ہیں ۱۵ جون ۱۸۹۵ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ حیات کی اس مختصر سی مدت میں ایسی گرانمایہ کتابوں کا لکھ دینا کسی معجزے سے کم نہیں ان کی تحریروں میں پختگی، ربط، استدلال کی قوت، ٹھوس معلومات کی فراوانی موجود ہے خشک موضوعات کو دلائل کے اسلحے سے آراستہ کرکے بہت ہی خوشگوار اور

---

[1] سرسید کا ادبیات اردو پر۔ علی گڑھ میگزین سرسید نمبر ص ۵۱۔

دل پسند بنا دیتے ہیں۔ انکے اسلوب میں منطقی ربط ہے اور خیال و الفاظ میں ہم آہنگی ملتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد۔ قرین قیاس یہی ہے کہ ۱۸۳۰ء کی پیدائش ہیں

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد نے دار فانی سے کوچ کیا۔ ان کے والد محمد باقر شیعہ
مجتہدین کے خاندان سے تھے۔ آزاد ذکاء اللہ، نذیر احمد اور ماسٹر پیارے لال کے ہم جلیس
تھے ۱۸۶۵ء میں کلکتہ کا سفر کیا، اسی سال کابل و بخارا گئے، ایران بھی گئے، انہوں
نے بھی اپنی تصنیفات سے زبان و ادب کے سرمائے میں زبردست اضافہ کیا۔
ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

سخندان فارس، نیرنگ خیال، سیاک و سماک، اردو ریڈریں، قواعد اردو، قصص ہند،
نصیحت کا کرن پھول۔ انکے علاوہ تذکرہ آب حیات، تذکرۂ علماء، کاشات عرب، لغت آزاد، ڈرامہ اکبر،
سیر ایران، فلسفۂ الٰہیات، جانورستان، مکتوبات آزاد، بیاض آزاد وغیرہ۔

آزاد بنیادی طور پر انشاء پرداز تھے۔ اسی لیے نیرنگ خیال کے مضامین کو
ان کی جملہ تصنیفات میں اولیت حاصل ہے۔

مولوی نذیر احمد۔ ان کا سن پیدائش ۱۸۳۱ء ہے نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے
گھر کے علاوہ مدرسہ اور پھر دلی کالج میں تعلیم پائی۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اسکے صلے میں
کانپور کی تحصیلداری کے بعد ڈپٹی کلکٹری ملی۔ سر سالار جنگ کی دعوت پر حیدرآباد گئے،
وہاں بورڈ آف ریونیو کے ممبر بن گئے، پنشن لے کر دلی آئے تو تصنیف و تعلیم کا کام جم
کر کیا۔ تمثیلی قصے یا اردو ناول جسے پروبلم سیریز کہا گیا ہے اس کے اولین معمار
یہی ہیں۔ ان کے ناولوں کے نام ہیں بنات النعش، مراۃ العروس، ابن الوقت
توبۃ النصوح، ایامیٰ، محصنات وغیرہ ان کے علاوہ مذہبی کتابیں ہیں امہات الامہ، الاجتہاد

قرآن مجید کا آزاد ترجمہ، وہ بڑے زود گو اور بسیار نویس تھے وہ ایک طرف آتش نوا
خطیب اور شعلہ نفس مقرر تھے دوسری طرف ان کے قلم کی جولانیاں مذکورہ کتابوں
میں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کہیں کہیں ان کا اسلوب بہت ہی صاف، دلکش اور شگفتہ
ہو جاتا ہے دلی کے محاورے، روزمرے، ضرب الامثال یا کہاوتیں استعمال کرنے کا
جیسا ملکہ ان کو تھا بہت کم لوگوں کو یہ دولت بے دار میسر آئی وہ عربی و فارسی
کی ناموس تراکیب و اصطلاحات کو داخل کر دیتے ہیں ورنہ ایسے کئی مقام ہیں،
جہاں ان کی تحریر سے کسی شہزادۂ لالہ رخ کی سی تازگی اور کسی چندر بدنی اور
مرگ نینی کا سا لوچ، لچک، نرمی اور ملائمی کا احساس ہوتا ہے ان کے بعض
کردار تو ادب میں زندۂ جاوید بن گئے ہیں ان میں مرزا ظاہر دار بیگ ابن الوقت
اور توبۃ النصوح ناقابل فراموش ہیں۔

نواب محسن الملک:۔ یہ خطاب ہے اصل نام سید مہدی علی تھا ۱۸۳۷ء
کی پیدائش ہیں۔ کلکٹری میں معمولی اہل کار تھے ترقی کر کے ۱۸۶۷ء میں مرزا پور میں
ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گئے اس سے پہلے تحصیلداری کر چکے تھے اسی دوران میں قانون مال
اور قانون فوجداری لکھیں۔ ذاتی مطالعے کے بعد شیعہ سے سنی ہو گئے اور
آیات بینات لکھی۔ ابتدا میں سر سید سے نالاں تھے۔ بعد میں ان کے زبردست
مداح ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں شملہ میں انتقال کیا یہ دلچسپ بات ہے کہ وہ سر سید کے
بہترین دوست اور حامی تھے مگر اپنے اسلوب کے ذریعہ ایک الگ طرح ڈال گئے جس میں
حقیقت سے زیادہ رنگینی کا پرتو ہے یہ شاید وہی اسلوب ہے جس نے پہلے ابوالکلام آزاد
اور جدید رومانوی تحریک کے زبردست علمبرداروں کو پیدا کیا۔ ان کی تحریر میں شگفتگی ہوتی ہے۔

اور ان کا استدلال گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی: حالی کی پیدائش کا سن ۱۸۳۷ء اور وفات کا سن ۱۹۱۴ء ہے انھیں ان کی سادگی کے سبب سعدیِ ہند کہا جاتا ہے۔ وہ سادگی پر دم دیوانے تھے انھوں نے شاعری کی اس کے بعد مقدمہ لکھا۔ ان کی تین سوانحی کوششیں بہت بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ تینوں ادبی شخصیتیں ہیں یعنی حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب اور تینوں سوانحی کارناموں کو اپنے اپنے میدان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حالی پہلے باقاعدہ سوانح نگار کہے جاتے ہیں، وہی اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد بھی بتائے جاتے ہیں غزل کے دائرے کو انھوں نے ہی وسعت دی اور دیا تھی! انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں آزاد کی انھوں نے علمی اور عملی دونوں طرح سے مدد کی۔ قوم کو ایک نئی راہ سجھائی۔ حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعے ایک جداگانہ اسلوب کی بنیاد رکھی وہ نہ اتنا خشک رہتا ہے کہ صحافت نظر آئے نہ اتنا رنگین ہوتا ہے کہ داستان محسوس ہو۔ ان کے اسلوب میں ادبی چاشنی بھی ہے اور منطقی استدلال بھی۔ ان کی سادگی سرسید کی سادگی سے مختلف ہے سرسید کا اسلوب کبھی کبھی بے کیف اور بے مزہ اور سپاٹ ہو جاتا ہے حالی بھی اپنے اسلوب کو بے نمک کا سالن اور ابلی کھچڑی بتاتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کا اسلوب بے مزہ نہیں ہوتا وہ سالن ہی رہتا ہے ساگ بھاجی نہیں بنتا۔ ان کی زبان پر مصنوعی پن کا گمان نہیں ہوتا۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ اور روزمرہ کی بولی جانے والی زبان کا خوب خوب استعمال کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں کبھی کبھی وہ یہ الفاظ ضرورت

سے زیادہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی پورے سرسید اسکول کی ہے ایسی چیز سے بعض لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سرسید تحریک انگریزوں کی یا تو پروردہ تھی یا ان سے ذہنی طور پر بری طرح مرعوب تھی کچھ بھی ہو متاثر ضرور تھی اور اثر انگریزی میں وہ کبھی کبھی اپنی تحریروں کے ذریعہ مغلوب نظر آتی ہے۔

مولانا محمد شبلی نعمانی: ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک دیہات بندول کی پیدائش ہیں۔ والد وکیل تھے۔ مولانا چریاکوٹی سے شبلی نے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۲ء میں سرسید سے ملاقات ہوئی اور یہ ان کے ہو رہے اور وہ ان کے بھی ہو گئے۔ مشہور بات ہے کہ اگر یہ ملاقات نہ ہوتی تو شبلی آج کے علامہ شبلی نہ ہوتے انھوں نے مشاہیرِ اسلام کو روشناس خلق کرنے کی ٹھانی۔ تحقیق و تاریخ اور جدید سوانحی اصولوں کو برت کر وہ ایک نادر و نایاب لٹریچر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے صحیح حالات کی تنقیح بھی اور اندازِ پیش کش کو حد درجہ دل کش اور دل آسا بھی بنایا۔ سیرت النبی، الفاروق، الغزالی، المامون وغیرہ ان کی زبردست تصنیفات ہیں ان کے علاوہ شعر العجم کے چار حصوں میں فارسی شاعری اور اد کی تاریخ، تعریف شاعری کی ماہیت اور اقسام کا بیان ملتا ہے اس کے علاوہ موازنہ انیس و دبیر علمی اور تقابلی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔

شبلی کا تعلق سرسید تحریک سے بڑا گہرا ہے یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں وہ خود ایک اسکول کے بانی مبانی بن گئے انھوں نے بھی ادب کا ایک مستقل صنف سوانح نگاری کے جدید اصولوں کی پیروی کر کے زبان و ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا۔ تنقیدی نگاہ کے اعتبار سے شبلی کا پایہ بہت بلند ہے ان کا اسلوب

نگارش اپنے عہد کے تمام لکھنے والوں پر سبقت لے گیا ہے۔ شبلی کا کارنامہ ان کا علمی، متوازن اور شگفتہ اسلوب ہے۔ شبلی کی نثر میں بڑا توازن ہے ان کی طبیعت تحقیق اور تاریخ کے کام کے لیے بہت ہی مناسب تھی۔ وہ جو کچھ کہہ گئے ڈنڈی کی تول پورا نظر آتا ہے۔ ان کا اسلوب حشو و زوائد سے پاک ہے۔ ان کے اسلوب کا جھکاؤ شاعری کی طرف ضرور ہے تاہم رنگینی اور حقیقت کے دو تاروں میں ایسا توازن اس درجہ کا امتزاج ہے کہ ان کے ملاپ سے ایک سرگم نکلتا محسوس ہوتا ہے ان کی نثر میں وضاحت و صراحت کے باوصف اختصار و ایجاد کا اعجاز ہے ان کا اسلوب میں میر امن کی خوبیاں رجب علی بیگ کی اچھائیاں اور غالب کی سادگی کے ساتھ ساتھ خود شبلی کی رنگینی ہے۔

آخر میں کہا جاسکتا ہے کہ سرسید تحریک سے اردو زبان و ادب کو بڑی توانائی میسر آئی بہ لحاظ خیال اور بہ لحاظ الفاظ دونوں طرح اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اس تحریک سے پہلے اردو نثر میں چند حکایتیں یا داستانیں تھیں شاعری میں غزل کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اور غزل کا دائرہ حسن و عشق تک محدود تھا تحریک کے کارکنوں نے داستانوں کی طلسم زائی سے اردو نثر کو آزاد کیا۔ پہلی مرتبہ ناول لکھے گئے، سوانح کی صنف کو جدید اصولوں کے مطابق استعمال کیا گیا تنقید جو اس سے پہلے ہاں اور نہیں تک محدود تھی اس میں تجزیاتی اور تحلیلی انداز بھی آیا گہرائی اور گیرائی کو جگہ دی۔ جانب داری کے بجائے اصول پسندی کو آگے رکھا گیا۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی بھی شروع ہوئی۔ ٹھوس مسائل کو موضوع گفتگو بنایا جانے لگا۔ غرض ادب میں حقیقت کا انعکاس زیادہ آگیا۔

غزل کو رنگینی کے حصار سے نکالنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ کائناتی مسائل کو غزل میں پیش کیا جانے لگا۔ نظم کا رواج ہوا۔ موضوعاتی نظمیں لکھی جانے لگیں آزاد نظموں کی طرف اسی دور میں ایک میلان پایا جانے لگا۔ تراجم کیے گئے اس سے زبان میں نئے نئے الفاظ داخل ہوئے۔ انگریزی الفاظ کو اس احساس کے ساتھ برتا گیا کہ نئے تصورات اور زبان و ادب میں عام ہو سکیں اور زبان نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل بن سکے اوپر ہم نے تحریک علی گڑھ کے تقریباً تمام اہم رفقاء کی تصنیفات کا جائزہ لیا ہے جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو شعر و ادب خاص طور سے اردو نثر ان سے پہلے تہی داماں تھی۔ مگر ان سب کی مشترکہ جدوجہد نے اسے پرمایہ بنا دیا اور اس طرح یہ مرحلہ اردو کی ترقی و ترویج میں بہت ہی سود مند اور مفید ثابت ہوا۔

— . —

اردو اور ہندی کا رشتہ

اردو اور ہندی کے رشتے کو سمجھنے کے لیے ان تاریخی حقائق پر نگاہ رکھنا ضروری ہے جن میں ایک ہی بولی کے دو ادبی روپ ہو گئے ایک اردو کہلایا اور دوسرا ہندی یہ کھڑی بولی جو دہلی میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی مسلمانوں کی دہلی میں آمد اور لاہور کے بعد دہلی کو پایۂ تخت بنائے جانے کا سب سے بڑا اثر زبان یا بولی پر یہ پڑا کہ وہ بولی جو کئی زبانوں کی آمیزش کے ساتھ بولی جاتی تھی اور جس کا کوئی روپ ابھی تک نکھر سنور کر سامنے نہیں آیا تھا دہلی کے پایۂ تخت بنائے جانے کے بعد اس کا روپ نکھر گیا اور وہ نئے عروض اور نئے رسم خط میں ڈھلنے لگی گویا وہ ادب کی زبان بن گئی۔ شروع کے سیاحوں اور مصنفوں نے اپنی تصنیفات اور تذکروں میں اس کا نام ہندی رکھا۔ ہند یا ہندوستان کی مناسبت سے چنانچہ خواجہ مسعود سعد سلمان کے تیسرے دیوان کو محمد عوفی نے لباب الالباب میں اور امیر خسروؒ نے اپنے دیباچہ غرۃ الکمال میں جو نام دیا وہ "زبان ہندی" تھا یعنی وہ مقامی بولی جو پنجاب کے سبزہ زاروں میں ترکوں کی ترک تازیوں کے وقت اس طرح بولی جا رہی تھی کہ اس پر قدیم کھڑی اور قدیم ہریانی کے نمایاں اثرات تھے خواجہ مسعود سعد سلمان کا ہندوی دیوان آج دستیاب نہیں یہ ہندی مسلمانوں کے سو سالہ سابقے اور رابطے کے بعد وجود میں آیا یہ بارہویں صدی کی بات تھی (۱۱۲۵ء یا ۱۱۳۰ء کے لگ بھگ) اس کے بعد تیرھویں چودھویں صدی میں (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء)

امیر خسرو آتے ہیں وہ اپنی زبان کو زبانِ دہلوی کہتے ہیں۔ ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں جن میں وہ عروض اور وہ رسم خط اختیار کیا جاتا ہے جو آج تک اردو کا نشانِ امتیاز ہے ان کے بعد نام دیو، کبیر داس اور گرو نانک علی الترتیب چودھویں پندرھویں اور سولہویں صدی میں آتے ہیں ان کے یہاں اپنی مادری زبانوں کے علاوہ برج اور کھڑی کا رنگ موجود ہے۔ مگر رسم خط اردو نہیں ہے وہ ناگری رسم خط بھی نہیں ہے اسی طرح بارھویں صدی میں کھڑی کا ایک شاعر ضرور نظر آتا ہے جسے خالص اردو کا شاعر تو نہیں کہا جا سکتا۔ اردو کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے یہی ہندی کے لیے کہا جا سکتا ہے مگر اردو ہندی کے جھگڑے کو اس گو مگو کی حالت سے ہوا مل جاتی ہے۔ آج ہندی والے ہندی کے دائرے میں میرٹھ اور برج کی کنٹریوں کے علاوہ راجستھانی، ہریانہ، اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش تک پھیلا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک راجستھانی، ہریانی، اودھی، برج اور بہاری سب کی سب ہندی میں شامل ہیں اور وہ اردو کو ہندی کا بگڑا ہوا روپ قرار دیتے ہیں مگر ان کے اس قول میں تاریخی حقائق کی تائید انہیں حاصل نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپ بھرنشوں کے عہد میں جو زبان رکھی گئی بدھ مت کے سدھوں اور جین مت کے عالموں نے جو کتابیں لکھیں انھیں ہندی زبان کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح جو دوہے گاتھائیں لکھی گئیں وہ راجستھانی یا پنگل یعنی قدیم برج میں ہیں ان کو بھی ہندی زبان نہیں کہا جا سکتا ہندی زبان کا روپ بھی کھڑی بولی ہی میں اپنا جلوہ پہلے پہل دکھاتا ہے اور ہندی کے بڑے بڑے ودھوان آج تو اسی کے قائل ہیں چنانچہ بھارتیہ اور پردیش ہندی کے جدید تاعام ہو گئی کہ ہندی کھڑی بولی کا ادبی روپ ہے باقی جتنی بولیاں، بھاشائیں اور زبانیں ہیں وہ ہندی کے دائرے سے خارج ہیں اور جب یہ کہا جائے گا تو معلوم ہوتا ہے کہ

ہندی کا کوئی نمونہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کا موجود ہی نہیں ہے اسی لیے گریرسن
نے ہندی کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے بتائی ہے اور یہی سبب ہے
کہ اردو والے اسے ایک مصنوعی زبان قرار دیتے ہیں۔

بہر کیف اگر ہندی کے دائرے میں راجستھانی، برج، بہاری، ہریانی اور اترپردیش
مدھیہ پردیش میں بولی جانے والی تمام بولیوں کو شامل کر لیا جائے تب اسکو تاریخی قدامت
حاصل ہو جاتی ہے اور پندرہویں صدی عیسوی تک ہندی کے لاتعداد نمونے
سامنے آتے ہیں جن میں ویر گاتھائیں بھی شامل ہیں دوہے اور کبت بھی شامل ہیں۔
خسرو، نام دیو، کبیر اور نانک کی بانی بھی کچھ شامل ہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے
اور بہت سے ہندی کے عالم اسی موخرالذکر نظریے کے حامل ہیں تب ہندی کا
کوئی نمونہ فورٹ ولیم کالج کے قیام یعنی انیسویں صدی سے پہلے کا نہیں ہے اسکے
باوجود بھی وہ کوئی مصنوعی زبان نہیں قرار دی جا سکتی۔ کیونکہ اس کا اس کے
بعد سے اب تک بالکل جداگانہ نشو و ارتقا ہوا ہے اور اس کا الگ اپنا لٹریچر
موجود ہے جس میں سنسکرت سے لے کر پراکرت اور اپ بھرنش کی الگ خصوصیات
کو اختیار کیا جاتا رہا ہے۔

اہل اردو کا نظریہ اس ضمن میں بالکل صاف ہے وہ خواجہ مسعود سعد سلمان کے نایاب
کلام کو اس احساس و یقین کے سبب اردو سمجھتے ہیں کہ اس میں کھڑی کا جز بھی شامل
ہوگا بالکل اسی طرح جیسے پنجابی اور ہریانی کے امکانات ہیں۔ اسکے بعد پھر خسرو
کے اسی کلام سے اسے سروکار ہے جس میں کھڑی بولی کی جھلک ملتی ہے اور ایک نئے
عروض اور رسم خط کو اختیار کیا گیا ہے۔ نام دیو، کبیر اور نانک کے کلام میں

کیونکہ کھڑی کا نقش ہے اسی لیے اردو والے ان کے کلام سے بھی استدلال کرتے
ہیں۔ مگر زیادہ نہیں بس اتنا ہی ہے کہ کھڑی بولی اس وقت کی ہمہ گیر یا ملک گیر زبان
تھی۔ اسکے بعد محمد افضل جھنجھانوی اور میر جعفر زٹلی سولہویں سترھویں صدی میں
آتے ہیں اور ان دونوں شاعروں سے بہت پہلے اردو شعر و ادب دکن میں لکھا
جانے لگتا ہے اس طرح اردو کھڑی بولی کے نمونے چاہے چودھویں صدی سے پہلے
کے باقاعدہ اور غیر مشکوک موجود نہ ہوں اردو میں پندرہویں صدی سے تصنیف و
تالیف کا باقاعدہ کام شروع ہو جاتا ہے اور وہ تمام نمونے آج بھی جوں کے توں
موجود ہیں اسی طرح موخرالذکر صورت میں تاریخی اعتبار سے اردو کو ہندی پر تقدم
زمانی حاصل ہے۔ اس کی شہادت اس تاریخی واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ شروع میں
اردو کا نام ہندوی، ہندی، ہندوستانی، زبانِ ہندوستان، زبانِ دہلوی، کھڑی، کھڑا
دکنی اور ریختہ لیا جاتا رہا ہے اگر ہندی پہلے سے موجود ہوتی تب اس نئے عروض
و نئے رسم خط پیدا ہونے والی زبان کو ہندی یا ہندوی یا ہندوستانی وغیرہ ہرگز نہ کہا جاتا
یا اگر دو زبانیں بعد کے کسی مرحلے میں شروع ہو گئی ہوتیں، تب نام رکھنے سے بہت پہلے ہی
ناموں کے بارے میں حدِ فاصل قائم کر دی جاتی۔

ہندی میں اٹھارویں صدی تک کچھ بھی نہیں ملتا انیسویں صدی کے آغاز میں انشاء
کی رانی کیتکی کی کہانی جو ۱۸۰۳ء سے ۱۸۱۵ء تک کے عرصے میں لکھی گئی اُسے ہندی کے
دائرے سے خارج بھی کرتے ہیں۔ انشاء کی یہ داستان مقامی آب و رنگ
اور اپنی مٹی کی بوباس رکھنے کے باوجود اردو رسم خط میں لکھی گئی اس لیے
اس میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتی اور یہ داستان بھی اس بات کا ثبوت ہے

کہ ہندی میں جو تصنیفات ہوئیں وہ غدر کے بعد کی ہیں فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی بھی اسکی ادبی شکل کو نکھارنے اور اپنی بیساکھیاں مہیا کرنے میں ناکام رہی۔

اسکے بعد یہ کہنا کہ کھڑی بولی کی ابتدا، ہندی کی شکل میں ہوئی اور اس کا ارتقا اردو کی شکل میں، غلط ثابت ہو جاتا ہے یا تو بدھ سدھوں، اور جین عالموں کی زبان کو ہندی مانیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہندی کھڑی بولی سے نہیں نکلی اور اگر اسکی ابتدا کھڑی بولی سے ہوئی تب اسکی قدامت ثابت نہیں ہوتی اس لیے مذکورۂ بالا تاریخی اجتہاد کے بعد یہ آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے کہ کھڑی بولی کی ادبی شکل کا آغاز اردو میں ہوا۔ اور اس کا ارتقا بھی اردو زبان و ادب کے ذریعہ ہوا۔ اردو کے عروج و ارتقا کو دیکھ کر ہندی میں بھی اس کی تجدید و احیاء ہوا۔

پروفیسر احتشام صاحب مرحوم کے مطابق لسانیاتی اعتبار سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں کہنا درست نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اردو کے صرف و نحو اور بیشتر افعال معروف ہندوستانی ہیں افعال اور افعال کے مشتقات ضمائر، حروف جار، سابقے، لاحقے اعداد کے نام خالص ہندوستانی ہیں۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے اس میں بھی اردو میں مقامی الفاظ کی زبردست بہتات و فراوانی ہے مگر ان کا پلہ ہر طرح سے بھاری ہے فرہنگ آصفیہ کے مؤلف کے مطابق اردو میں مقامی یا دیسی یا ہندوستانی الفاظ کی تعداد ½ ۳۰ فی صد ہے جبکہ عربی و فارسی کے الفاظ ½ نصف فی صد میں اور بیرونی زبانوں مثلاً انگریزی اطالوی، ڈچ، پرتگیزی وغیرہ کے کل ملا کر ۱ فی صد الفاظ اردو میں شامل ہیں۔

اسکے علاوہ زبانوں کے مطالعہ اور ان کے بناؤ سنگار میں ذخیرۂ الفاظ سے

زیادہ صوتیاتی نظام یا اصوات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس لحاظ سے اگر ہم زبان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو نے جہاں کل دو آوازیں "غا" اور "قا" (غ اور ق) کی عربی سے لی ہیں۔ فارسی سے تین یا ساڑھے تین آوازیں (خ، ژ، ف) خا، ژا، فا کی اور آدھی آواز یعنی جو بہت کم استعمال ہوتی ہے) ژا کی لے ہے جو چند لفظوں میں استعمال ہوتی ہے مثلاً مژدہ، جانفزا، یا مژگان دراز وغیرہ۔

اسکے برخلاف اردو نے ہکار آوازوں کا پورا سیٹ ہندی یا سنسکرت سے لیا ہے، ہکار آوازیں ہیں بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ، گھ، دھ، ڈھ، لھ، مھ، ڑھ اور نھ ان کے علاوہ اردو نے معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، اور ڑ سنسکرت کے توسط سے دراوڑی خاندان سے لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مقامی آب و رنگ کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے اور یہ کہ اس کی وسیع النظری ہند آریائی ہند ایرانی، سامی اور دراوڑی میں یا نفرت کی قایل نہیں ہے۔

آج ہندی میں اردو کے توسط سے اس کی دیکھا دیکھی پانچوں بیرونی آوازوں خا، ژا، غا اور قا کو کسی حد تک اپنے قالب میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے گو وہ ابھی تک اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہے اسی لیے خالص ہندی اعتقادی صوت زا کو جا میں بدل دیتے ہیں مثلاً ضرورت کو جرورت "خا" کو کھا کہتے ہیں مثلاً خوش کو کھوس کہتے ہیں فا کو پھا مثلاً فارسی کو پھارسی اور کبھی کبھی تو الٹی صورت بھی نظر آتی ہے، مثلاً پھل کو فل روز کا مشاہدہ ہے اسی طرح قا کو کا میں بدل دیا جاتا ہے مثلاً نقد کو نگد کہا جاتا ہے یا غلام کو گلام کہتے ہیں۔

ہندی والوں کی یہ بہت بڑی کمی ہے کہ وہ نئی آوازوں کا احساس رکھنے کے باوجود بھی ان کی ادائگی پر خود کو قادر نہیں پاتے۔ اس کے برخلاف اردو والے ہر آواز کو اپنے طور پر بدلنے اور بولنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ سنسکرت کے زیر اثر بہت قدیم کی روایت کو ہندی نے اپ بھرنشوں کے برخلاف اپنایا ہے اور "ڑ" کی آواز کو بدستور جاری رکھا ہے اردو والے اس آواز کو "ن" میں بدلتے آئے ہیں اور اس کا سبب تن آسانی نہیں ہے اور نہ ہی مقدرت کے فقدان کا باعث ہے بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اردو نے اپ بھرنشوں کی روایت کو ہمیشہ آگے رکھا اور اس کے مطابق تت سم تدبھو میں بدلنے کا رواج قائم کیا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اب ہندی والے بھی انہی اپ بھرنش والی روایت کو اپنانے کا بیشتر موقعوں پر مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور جدید ہندی میں یہ رجحان چل نکلا ہے کہ وہ لوگ "ڑ" کی آواز کے بجائے نون (ن) کی آواز پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً گن تنتر بجائے گنڑ تنتر، کرشن بجائے کرشنڑ، گنیش بجائے گنڑیش وغیرہ۔

مذکورہ آوازوں کو اردو ہندی کے اختلاف کے ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے مگر اب یہ ایک رشتہ کی صورت بھی پیدا ہو رہی ہے۔

اردو میں خوشے توڑ کر پڑھنے یا بولنے کا عام رواج رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اردو والے ایک مدت تک میر امن کی نثر اور میر تقی میر کی روزمرہ کو مستند مانتے آئے ہیں جس طرح عوام بولتے رہے اس کو وہ قبول کرتے رہے بول چال میں بھی اور ادب میں بھی۔ الفاظ کی اصل سے انھیں یا تو واقفیت نہ تھی اور یا پھر دیسی اپ بھرنشوں کی پیروی کہ تت سم کو تدبھو بنا لیا گیا اسی لیے اردو میں چندر، پریم، گرام، مہندر، سریندر، دھرم وغیرہ کو چندر، پریم، گرام، مہندر، سریندر

اور گرام ہو جاتے ہیں یہ صورت (CONSONANTS) میں ہوتی ہے اسی طرح (VOWELS) میں بھی بعض خفیف مصوتے اردو میں طویل ہو جاتے ہیں مثلاً گھوپٹ کا گھونٹ وغیرہ۔ مگر یہ ہندی میں بھی ہے مثلاً گپت کا گپتا اور برعکس کہیں کہیں زیر، زبر میں فرق ہو جاتا ہے مثلاً ہندی کے "ناگِن اور مالِن" اردو میں ناگَن اور مالَن بن جاتے ہیں (ہندی ہی پر کیا منحصر ہے۔ ترکی کی بیگم بھی بیگم، عُنقا، عَنقا۔ نَقَش، نُقش بن جاتے ہیں اور یہ سیکڑوں سال کا طرز عمل ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ جب کہ اس پر اگر سند میں سید انشا اور آتش زما چکے اور بول برت کر دکھا بھی چکے۔

بعض آوازیں حذف کر دی جاتی ہیں بولنے لکھنے میں آتی ہیں، مثلاً دھوندھو اردو کا یہ طرز عمل بھی ہندی کے علاوہ فارسی عربی الفاظ کے ساتھ بھی اسی قسم کا رہا ہے مثلاً عضو، جزو، وغیرہ میں یہی شکل روا رکھی گئی ہے۔

بعض آوازیں اردو میں ایک ہی مگر عربی وفارسی کے زیر اثر رسم خط میں جداگانہ طریقوں پر رکھی جاتی ہیں۔ مثلاً سا کی آواز کے لیے "ز، ذ، ض، ظ وغیرہ آ" کیلیے الف ع اور تا کے لیے ت اور ط" ہندی میں ان سب کے لیے ایک ایک آواز ہے ہندی میں بعض اردو الفاظ کو سادہ کر دیا جاتا ہے مثلاً ش کی جگہ "س" (جس کی کوئی غرض وغایت اور معقولیت سمجھ میں نہیں آتی) خ، ز، ف، غ اور ق کو بدل دیا جاتا رہا باوجودیکہ ہندی والے اب ان کی پیروی کی تھوڑی کوشش بھی نقطوں کے التزام وغیرہ سے کر رہے ہیں اردو نے جو از دیگر زبانوں سے

قبول کیا ہے ہندی اردو سے اثرات قبول کر رہی ہے۔ مجموعی بالا گفتگو کے نتیجے میں جو حقیقت سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو ادبی روپ ہیں۔ دونوں کے عروض میں بڑی یکسانیت ہے تاہم رسم خط میں قطبین کا فرق ہے۔ دونوں کو ایک زبان نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اردو کو ہندی کی ایک شکل قرار دے کر اس کی اہمیت کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ نہ اردو کو ہندی کا شیلی بتایا جا سکتا ہے دونوں کا آغاز تاریخی حالات میں ہوا اب دونوں کا جداگانہ وقیع ادبی سرمایہ موجود ہے۔ اس لیے دونوں تاریخی اور لسانی اعتبار سے کچھ مماثلتیں رکھنے کے باوجود اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتی ہیں۔ تاہم یہ کوئی جھگڑے کی وجہ نہیں ہے اس لیے کسی کی انفرادی شان کو گھٹانے کی ضرورت نہیں ہے تاہم دونوں کو اپنے اپنے انفرادی کریکٹر کے ساتھ پھلنے پھولنے اور پھولنے کے مواقع میسر آنے چاہئیں۔

اردو رسم الخط

اردو رسم خط کا مسئلہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے جس کے بارے میں مختلف افراد کی مختلف رائے ہیں پائی جاتی ہیں کچھ سادہ لوح کہتے ہیں کہ موجودہ رسم خط کو ترک کر کے ناگری رسم خط یا رومن رسم خط اپنا لینا چاہیے تاکہ اردو کی ترقی میں کوئی بادھا یا مشکل نہ آئے اور اس کا حلقہ وسیع ہو جائے۔ کچھ دوسرے لوگوں کے نزدیک رسم خط کا معاملہ محض لباس کا سا نہیں ہے کہ جب چاہے اس کو اتار کر دوسرا بدل لیا جائے ان کے نزدیک زبان کا رسم خط جسم و جان کے رشتے کی طرح ہے جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہو جاتا ہے اور روح بغیر جسم کے ایک بے معنی حقیقت ہے اسی طرح رسم خط کے بغیر زبان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس نازک نکتے کی بازیافت میں اور آگے جاتے ہیں اور صاف و صریح اور صحیح کہتے ہیں کہ زبان سے رسم خط کا تعلق وہی ہے جو جسم سے جلد کا تعلق ہے جس طرح جسم سے جلد کو نہیں اتارا جا سکتا (اتارا جائے گا تو جان باقی نہ رہے گی) اسی طرح رسم خط کو چھوڑ کر کسی دوسرے رسم خط کو اوڑھا نہیں جا سکتا جس طرح جلد جسم سے پیوست اور مربوط ہوتی ہے اسی طرح رسم خط زبان سے اسکے مزاج و منہاج کی مناسبت سے لپٹا جڑا ہوتا ہے کہ اگر کوئی جارحانہ الگ کرنا بھی چاہے تو جسم کی تکا بوٹی تو ہو سکتی ہے ایک صحیح و سالم وجود نہیں رہ سکتا ایسی صورت میں رسم خط بدلنے کی بات یا تو جہالت ہے یا پھر ایسی سادہ لوحی جس کا براہ راست تعلق حماقت محض سے ہے۔

اردو زبان کا تعلق جس طرح مختلف زبانوں سے ہے اور رہا ہے وہ ایک ملی جلی
اور طرار زبان ہے اس نے ملکی اور غیر ملکی عناصر سے تربیت پائی اور ان دونوں عناصر
کا اس میں ایک حسین امتزاج اور آمیزش ملتی ہے اسی طرح اردو رسم خط کی روایت بہت
قدیم اور وسیع ہے اردو رسم خط معمولی تبدیلیوں کے ساتھ فارسی سے لیا گیا ہے فارسی
رسم خط عربی رسم خط کی دین ہے قدیم فارسی یا ہند ایرانی رسم خط جدید فارسی رسم خط سے
مختلف تھا عربی رسم خط ظہور اسلام سے پہلے مختلف انداز میں لکھا جاتا تھا عربی رسم خط
خفیقی اور ارامی رسم خط کی دین ہے۔ خفیقی رسم خط مصری رسم خط سے ماخوذ ہے انسائیکلو
پیڈیا امریکانہ کے مطابق اکادی یا آشوری رسم خط مصری رسم خط سے قدیم نہیں ہیں خط
شناسی کی تاریخ میں مصری خط کو تقدم زمانی حاصل ہے اسے خط تمثالی (PICTOG
RAPHY) بھی کہا گیا ہے شروع میں تصویروں کے ذریعہ خطوط یا تحریر کا آغاز ہوا
دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مصریوں سے فنیقیوں نے ان سے بھی یونان
نے ان سے اطالیہ نے اور ان سے دیگر اقوام یورپ نے لکھنا سیکھا فنیقیوں سے سامیوں
نے براہ راست تحریر کی تعلیم حاصل کی کیونکہ ان کے تمام خطوط فنیقی رسم خط سے
ماخوذ ہیں۔ قدیم عبرانیوں نے بھی فنیقیوں سے براہ راست فائدہ اٹھا کر جو خط ایجاد کیا وہ
سامی کہلاتا ہے اسی طرح اردو رسم خط جو فارسی یا عربی رسم خط سے ماخوذ ہے اس کی
روایت بہت قدیم ہے اس میں ایک تواتر اور تسلسل ہے جس کو رسم خط کے مسئلہ
پر گفتگو کرتے ہوئے نگاہ میں رکھنا ضروری ہوگا۔

اس تاریخی پہلو پر نگاہ کرنے کی اسلئے بھی ضرورت ہے کہ اردو شعر و ادب پر عربی و فارسی
شعر و ادب کا بہت گہرا اثر رہا ہے اردو شعر و ادب میں عربی و فارسی روایات کتب مقدسہ کے

حوالہ جات، تلمیحات کا استعمال اور خود اردو لکھنے والوں کے رجحانات نے زبان کا کینڈا اور
اس کے ساتھ اس کے رسم خط کی ایک روایت قائم کرتے آئے ہیں باوجودیکہ اردو نے دیسی الفاظ
اور مقامی محاورے کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے اس کے باوجود بھی اس کا رشتہ عربی اور فارسی
زبانوں سے اٹوٹ اور ناقابل شکست ہے الفاظ اور اصوات کے پہلو بہ پہلو زبان کا اپنا ایک
مزاج ہوتا ہے اردو کا مزاج موجودہ رسم خط کو ہی قبول کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے اڑیا
آسامی، بنگالی وغیرہ زبانیں ایک ہی اصل سے ہونے کے باوجود بھی اپنے جداگانہ رسم خط
رکھتی ہیں ان کے علاوہ قدیم سنسکرت سے نکلنے والی بے شمار جدید ہند آریائی بولیاں ہمارے
ہی ملک میں اپنے مختلف رسم خط اختیار کئے ہوئے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس کے سبب یہ مطالبہ کیا
جاتا ہے کہ اردو رسم خط بدل دینا چاہیے۔

کسی زبان کے رسم خط کو ترک کر کے اس کے لیے کسی دوسرے رسم خط کو اپنانے کی
خصوصاً دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔

اولاً یہ کہ یکسانیت پیدا کرنے اور مغائرت و منافرت کو دور کرنے کے لیے یہ کیا جائے
تاکہ مختلف زبانوں کے درمیان اور زبانوں کے توسط سے مختلف انسانی گروہوں اور
فرقوں اور طبقوں کے درمیان رواداری، اتحاد، ایک جہتی اور ایکتا کی فضا پیدا کی
جا سکے بظاہر یہ خیال بڑا ہی بے ضرر مخلصانہ اور معصومانہ لگتا ہے تاہم اس میں ایک
قسم کی جارحانہ، معاندانہ اور مغلوبانہ ذہنیت پروان چڑھتی نظر آتی ہے ایک مشترکہ
تہذیب والے ملک میں جہاں مختلف پھولوں کو پھولنے پھلنے اور پھیلنے کے مواقع میسر آنا
چاہئیں اور جہاں کا نشانِ امتیاز یہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص جس طرح عقیدے کی

آزادی رکھتا ہے اسی طرح مختلف زبانوں کو بولنے اور ان کو مختلف پیرائے اور اسلوب سے
لکھنے کی آزادی بھی رکھتا ہے ادغام یا مدغم کرنے کی کوشش مستحسن نہیں کہی جا سکتی ہماری
تہذیب کا حسن یہی ہے کہ اس میں مختلف رنگوں کے پھول ایک ہی گلستاں میں اپنی اپنی
شاخوں پر کھلتے اور مشامِ جاں کو معطر بھی کرتے اور دلوں کو لبھاتے بھی ہیں ہماری ہندوستانی
تہذیب میں بے کیف یکسانیت کی جویا نہیں ہے بلکہ اس میں رنگارنگی، تنوع اور بوقلمونی ہے
ہر جلوہ بیدار رکھتا ہے اور توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے ہماری گنگا جمنی تہذیب میں اس
جارحیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تمام دھارے ایک ہی رنگ اور ایک ہی روانی کے
ساتھ بہیں جب پوری تہذیب کی مشترکہ خصوصیات کو نہ صرف انگیز کیا جاتا ہے بلکہ
سراہا جاتا ہے۔ پھر رسم خط کے مسئلہ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ اسکو یکسانیت
کی تیغ خوں آشام سے ہلاک کر دیا جائے۔

دوسری وجہ کسی رسم خط کی کمی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی رسم خط ناقص ہو تو اسکو
بدلنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا تاہم اسمیں بھی تبدیلی کا سبب زبان کی مقبولیت کو گھٹانے یا اسکے
اوصاف کو کم کرکے دکھانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے دائرے کو وسیع کرنا ہی ہوتا ہے اگر اس کا
رسم خط اس کے دائرے کو پھیلنے کی راہ میں حائل ہو رہا ہو تب ہی اس میں تبدیلی آنا چاہیے

کیا اردو رسم خط ناقص ہے؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ اردو رسم خط ناقص
یا نامکمل نہیں ہے (اور اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں کوئی کمی ہے ہی نہیں)
اردو کیونکہ ایک ملواں زبان ہے وہ بڑے فرقوں کے میل ملاپ سے وجود میں آئی ہے اسلیے
سرشت میں اتحاد رواداری داخل ہے ہماری گنگا جمنی تہذیب کی سب سے بڑی
نشانی اردو ہی ہے اس میں اخذ و قبول کی صلاحیت تہذیبی سطح پر بھی رہی ہے

اور ادبی و لسانی سطح پر بھی موجود ہے مثال کے طور پر اردو نے جہاں عربی سے دو
آوازیں (قا اور غا) لیں فارسی سے تین یا چار آوازیں (ژا، خا، فا، ذا) لیں
ہند آریائی زبانوں کے توسط سے اردو نے دراوڑی خاندان سے تین معکوسی آوازیں
(ٹا، ڈ، ڑ) لیں ان کے علاوہ ہند آریائی سے ہکار آوازوں کا پورا سیٹ اس
طرح لیا کہ وہ اردو کا ہی جزو لگتی ہیں (یعنی بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ، گھ، دھ
ڈھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ لیں) اردو رسم خط ہر آواز کو لکھنے کی پوری پوری صلاحیت
رکھتا ہے ان میں کوئی آواز ایسی نہیں ہے جس کی ادائیگی میں اردو رسم خط قاصر ہو
یا جسے مشکل سے لکھا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ "نڑ" کی آواز جو سنسکرت کو بہت مرغوب
رہا ہے اور جسے اپ بھرنشوں نے سنسکرت دشمنی میں ہمیشہ پس پشت ڈالا اور
جسے جدید ہندی بھی زیادہ اونچا مقام نہیں دیتی بلکہ اس کی جگہ "ن" کی آواز کو
ترجیح دیتی ہے، ہندی کی پیروی میں اردو بھی اس آواز کو "ن" میں ہی بدلنے کا
رجحان رکھنے کے باوجود "نڑ" کو بھی استعمال کرنے میں تامل نہیں کرتی۔

اس کے برخلاف ناگری رسم خط کے حامیوں کا انداز ہے ان میں سے بیشتر افراد
اردو کے زیر اثر فارسی اور عربی کی پانچ یا چھ آوازوں کو جتنی اپنانے کی کوشش
کرتے ہیں ہندی یا ناگری کا رسم خط ان کی اس اپنائیت میں آڑے بن جاتا ہے کیونکہ ناگری
رسم خط ان آوازوں کی اصل سے بہت دور ہے اس لیے وہ ان کی صحیح
ترجمانی میں اکثر قاصر رہتا ہے ناگری رسم خط کا دائرہ بہ لحاظ اصوات
اور بہ لحاظ الفاظ محدود ہو جاتا ہے اس طرح اردو کو اس کے موجودہ رسم خط
کو ترک کر دینے سے اس میں وسعت و پھیلاؤ کے بجائے ناقابل تلافی نقصان ہوگا

ایسی صورت میں اس کے لیے ناگری رسم خط کو اختیار کرنے کی تجویز مضر اور مہلک ثابت ہوگی۔ اس مقام پر اگر کوئی ناگری رسم خط کے حامیوں کو یہ مشورہ دے تو اس کی معقولیت سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے فروغ کے لیے اس کا رسم خط ترک کرکے فارسی یا عربی رسم خط اختیار کرلیں۔ تاہم ایمان کی بات یہ ہے کہ ہمیں موجودہ ہندی والوں کو یہ مشورہ نہیں دینا چاہیے، کیونکہ ہندی اور اردو اپنی مختلف تاریخ اور جداگانہ وقیع ادبی سرمایہ رکھتی ہیں۔ اس لیے اگر وہ اس نہج پر اپنے فرق کو مٹا دیں تو ان زبانوں کی سالمیت اور وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

اردو رسم خط اس لیے بھی درست ہے کہ یہی رسم خط مشرق وسطی اور ایشیا کے بے شمار ممالک ایران، پاکستان، افغانستان، ترکی، مصر اور عرب و افریقہ کے بہت سے ممالک اور ملکوں کا بھی ہے اس طرح یہ ان تمام ملک سے تعلق کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا رہا ہے۔ آنکھیں ان کی پہلے سے عادی رہی ہیں ان کو پڑھتے ہوئے ان ممالک میں گھومتے ہوئے اجنبیت کے بہت سے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ بہر معمولی سی کوشش سے ان کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

موجودہ اردو رسم خط کی ایک بہت بڑی خوبی جو آج کے اسپٹنک اور میزائل کے دور میں تو بہت اہم ہوگئی ہے اس کی مختصر نویسی (SHORT HAND) ہے آج وقت کی قیمت کا جو احساس جڑ پکڑ گیا ہے آج سے پہلے وقت کی اتنی قدر دانی شاید کبھی نہ تھی اس لیے اردو رسم خط جو حرفوں کو ملا کر لکھا جاتا ہے اس کے ذریعہ بہت تھوڑے وقت میں اور بہت کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ بات لکھی جا سکتی ہے

یہ رسم خط اس کی جمالیاتی پذیرائی کا سبب ماضی میں بھی بنتا رہا ہے اور اس رخ کو آگے بڑھانے کے روشن امکانات آج بھی معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ اردو رسم خط کے سبب اس خط نسخ، خط نستعلیق، خط ثلث، خط ریحان، خط غبار و تحریر کی خوشنمائی کے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ خط شکست یا خط شفیعہ تحریر کو تیزی اور پھرتی سے لکھنے کا ایک بہت ہی موثر ذریعہ رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی میں طباعت اور کاغذ کے خرچوں میں زبردست کمی کا باعث اردو رسم خط بن سکتا ہے جہاں تک اردو رسم خط میں اعراب کے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس میں اعراب نہ لگانا وقت اور جگہ دونوں کی بچت کے لیے ہے اور یہ بھی کہ بغیر اعراب کی عبارت تو مشقوں کیلئے نہیں ماہرین اور زبان دانوں کے لیے ہے۔ یہ ایک قسم کا زبان دانی کا معیار بھی ہے اسی طرح گھسیٹ لکھائی یا خط شکستہ اردو رسم خط کی ایک بڑی خوبی ہے جس کے ذریعے کم وقت میں بڑے بڑے مفاہیم سمیٹے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام خصوصیات اردو کے موجودہ رسم خط کی خوبیاں ہیں اگرچہ اس رسم خط سے کچھ خرابیاں بھی منسوب ہیں۔ تاہم غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ رسم خط کی خامیاں نہیں ہیں۔ اردو املا کی خامیاں ہیں اسی طرح رسم خط اور املا دو مختلف چیزیں ہیں ان میں حد فاصل قائم کرنا ضروری ہے بعض لوگ مخالفت کے جوش میں اور کچھ لوگ اردو کی ہمدردی کے جوش میں اردو املا کی کوتاہیوں کو اس کے رسم الخط کی خامیاں تصور کر کے خفیف الحرکتی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر اردو میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے مثلاً بِل، بیل، ریل وغیرہ کو بَیل، بِیل اور رِیل بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ لکھا ہوا لفظ

اور اس کا تلفظ اس وقت تک واضح نہیں ہوتا جب تک کہ خود آدمی اس لفظ سے پہلے سے واقف نہ ہو، یا کوئی عین وقت پر اس کی رہنمائی نہ کرے مثلاً سبزی رجحان، خطو غیرہ واؤ اور دال میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً پرواز، پرواز کتابت کے ہاتھوں مجروح تماشا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح لکھا کچھ جاتا ہے پڑھا کچھ جاتا ہے۔ مثلاً بلکل کا بالکل، خاب کو خواب وغیرہ۔ اعلا کو اعلیٰ، ادنا کو ادنیٰ وغیرہ الف مقصورہ کا بے جا استعمال اور اردو رسم خط کو پیچیدہ بنا دیتا ہے اور سب سے زیادہ پیچیدگی تو ہم آواز حروف کی موجودگی ہے۔ تا کی آواز کے لیے ت، ط، سا کی آواز کے لیے س، ث اور ص۔ زا کے لیے ذ، ز، ظ، ض۔

اس گفتگو میں پہلی بات تو یہ واضح ہونی چاہیے کہ مذکورہ تمام کوتاہیاں موخر الذکر کی استثنا کے ساتھ اردو رسم خط کی کوتاہیاں نہیں ہیں اور املا کی کوتاہیاں ہیں اس لیے ان سے بحث کا یہاں کوئی محل نہیں۔ اردو املا کی درستی میں کیے جانے والے التزام ان کی درستی کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہم آواز حروف کی بات ہے وہ یقیناً سیکھنے والوں کے لیے پریشانی کا موجب ہوتے ہیں۔ تاہم اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان ہم آواز حروف کے سلسلے والے لاتعداد، الفاظ اردو زبان وادب کے سرمائے کو مالا مال کیے ہوئے ہیں ان سے محرومی یا ان کا ترک دراصل زبان کے دامن کو سکیڑ سکتا ہے پھیلا نہیں سکتا۔ اسکے علاوہ لسانیاتی مطالعہ میں یہ حروف بہترین پہچان ہیں اس بات کی کہ کون سا لفظ اپنی اصل میں عربی یا فارسی یا ہندی کس زبان سے مستعار لیا گیا ہے سید انشاء اللہ خاں انشاء

کی رانی کیتکی کی کہانی میں ان کے دعوے کے علی الرغم جو ان کی گرفت ہو سکی وہ اس طرح ممکن ہوئی کہ انھوں نے کچھ عربی فارسی کے لفظوں کے حروف میں تبدیلی کر کے انھیں دیسی بنانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مثلاً طبلے کو انھوں نے تبلہ لکھا اور اس طرح پہچاننے والوں نے پتہ لگا لیا کہ انھوں نے عربی کے کس لفظ کو یہ دیسی لباس پہنایا ہے اسکے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم آواز حروف کے استعمال کو بھی تغیر و تبدل کے عمل سے گزار کر اور زیادہ سائنسی بنایا جا سکتا ہے اسی طرح جیسے الف مقصورہ کے استعمال میں بعض اہل نظر نے یہ اہتمام کرنا شروع کیا ہے کہ آدھے الف "اوری" کے بجائے پورا الف لکھتے ہیں مثلاً اعلا، ادنا، اسحاق، اسماعیل وغیرہ۔

اسی طرح اردو املا میں ایک اور رجحان تقویت پا رہا ہے اور وہ ہے فارسی کے برخلاف لفظوں کو زیادہ جوڑنے کے بجائے الگ الگ لکھنے کا رجحان مثلاً چنانچہ کے بجائے چناں چہ، علیحدہ کی جگہ علاحدہ، گلچینی کے بجائے گل چینی گلدستہ کی جگہ گل دستہ وغیرہ۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو رسم خط ایک مکمل رسم خط ہے اس لیے اُسے کسی حالت میں بھی نہیں بدلا جا سکتا۔ اول تو رسم خط کا تعلق جسم سے جلد کے تعلق کی طرح ہے جسم کی جلد اس وقت اتر بھی جاتی ہے جب جذام یا برص کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو۔ چنانچہ ترکی زبان کے رسم خط کی تبدیلیوں میں ایسی ہی کوئی بیماری رہی ہوگی تاہم اردو رسم خط مستند روایات کا علم بردار ہے اسکی روایت ماضی میں اتنی دور تک گئی ہے جتنی خود تحریر کی روایت ہے۔

رہی ملکی حالات کی بات تو پورے ملک کا ایک رسم خط محض خوش آئند تصور ہے

جس کے ڈانڈے، دیوانے کے خواب سے جا ملتے ہیں۔ ہندوستان میں زبانوں کے چار بڑے بڑے خاندان ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے علاقے بٹے ہوئے ہیں۔ ہر تیس میل کے فاصلے پر لب و لہجہ میں فرق آجاتا ہے سینکڑوں بولیوں کو یکجا کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اس سلسلے کی ہر کوشش توانائیوں کو ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ یوں بھی ایسی کوئی روایت کسی دوسرے ملک میں بھی موجود نہیں ہے باوجودیکہ ان میں سے کچھ ممالک کے پاس زبردست عسکری تنظیم اور فکری وحدت موجود ہے۔ اس لیے یہ یہاں اور بھی قابلِ عمل نہیں ہے اس قسم کی ہر کوشش سے منافرت و مخاصمت کو ہوا ملے گی۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس گلستاں میں ہزاروں طرح کے پھولوں کو اپنی مخصوص بو، باس اور اپنے خاص آب و رنگ کے ساتھ پھلنے، پھولنے اور پھیلنے کے مواقع دیئے جائیں کہ یہی وقت کی آواز ہے اور یہی اس مسئلہ کا بہترین حل ہے۔ فی الواقع یہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں ایک سیدھی سادی حقیقت کو مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

———— ٭٭٭ ————

اصطلاحات سازی اور اردو

زبانیں مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتی ہیں پہلے کچھ نئی آوازیں کان میں پڑتی ہیں، آمد و رفت سے نئے الفاظ کا لین دین ہوتا ہے۔ اس لین دین سے ایک ٹوٹا پھوٹا محاورہ ترتیب پاتا ہے۔ جملے اور فقرے بنتے ہیں اور زبان ڈھل جاتی ہے۔ زبان کے زیادہ استعمال سے اس میں باریکیاں پیدا ہونے لگتی ہیں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ایک سے زیادہ الفاظ کا چلن زبان میں عام ہوتا ہے، جسے مترادفات کے ذیل میں رکھا جاتا ہے یعنی ایک ہی مفہوم کیلئے کئی الفاظ کی موجودگی اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان میں وسعت و ہمہ گیری آگئی ہے اس کے برعکس بھی ہوتا ہے یعنی ایک ہی لفظ بہ یک وقت کئی معنی دیتا ہے یا ایک سے زیادہ معنی دیتا ہے مثلاً گرہ کا لفظ جس کے معنی گانٹھ کے ہیں گز کا سولھواں حصہ بھی رنج و ملال عقدۂ لاینحل، تعلقات کی خرابی یا ناخوشگواری، گلٹی، شعر کا دوسرا مصرعہ اور وہ مصرعہ جو مصرع طرح پر لگایا جائے وغیرہ مفاہیم ابھی ایک لفظ میں پائے جاتے ہیں۔
کسی بھی ترقی یافتہ زبان میں لفظوں کی یہ صورتیں پائی جاتی ہیں کہ یعنی ایک معنی تو وہ مروج ہوتے ہیں جو روزمرہ استعمال سے فطری انداز میں بار پاتے ہیں، دوسرے معنی وہ ہوتے ہیں جنھیں اہلِ علم زبان کی ضرورتوں کے مطابق متعین کرتے ہیں، یا لفظوں میں ان نئے مفاہیم کو داخل کردیتے ہیں یہ عمل جو شعوری ہوتا ہے باہمی مشورہ و مصلحت سے ہوتا ہے اور اسلیے ہوتا ہے کہ وہ زبان اپنے اندر کچھ نئے تصورات کو جنم اور جگہ دے۔ یہ مرحلہ زبانوں کی زندگی میں اسوقت آتا ہے جب

کوئی زبان دیگر علوم و فنون سے خود کو آشنا کرنا چاہتی ہے اسلیے یا تو وہ دیگر زبانوں کے
علوم و فنون کی ان اصطلاحوں کو جو پہلے سے موجود ہیں من و عن قبول کر لیتی ہے یا اس
میں حک و اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کرکے انھیں یوں اپنا لیتی ہے کہ اسی کا جزو لگنے لگتے ہیں
اصلاح کے لغوی معنی کے ذیل میں فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے "جب کوئی قوم یا فرقہ
کسی لفظ کے معنی موضوعہ کے علاوہ یا اس سے ملتے جلتے کوئی اور معنی ٹھہرا لیتا ہے تو اسے اصطلاح
یا محاورہ کہتے ہیں کیونکہ اصلاح کے لغوی معنی باہم مصلحت کرکے کچھ مقرر کر لینے کے ہیں اسی طرح وہ
الفاظ جنکے معنی بعض علوم کے واسطے مختص کر لیے ہیں اصطلاح علوم میں داخل ہیں خیال
رہے کہ اصطلاحی اور لغوی معنوں میں کچھ نہ کچھ نسبت بھی ضرور ہوتی ہے۔"[1]

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر لفظ اصطلاح نہیں ہوتا اسلیے کہ اصطلاح کی تعریف
ہی یہ ہے کہ وہ لفظ جو کسی خاص مفہوم کی ادائیگی کے لیے شعوری طور پر باہم صلاح و مشورے سے گڑھا جائے
جبکہ زبانوں میں مستعمل الفاظ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ کسی مشاورتی مجلس میں نہیں گڑھے جاتے بلکہ کسی
ایک شخص سے شروع ہو کر پوری جماعت پر محیط ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی لفظ میں دو یا دو سے زیادہ معنی
ہوں ان میں ایک معنی عمومی ہوں گے اور دوسرے اصطلاحی اور کیونکہ ہر لفظ میں ایک سے زیادہ معنی
نہیں ہوتے اسلیے ہر لفظ کو اصطلاح نہیں کہا جا سکتا اصطلاح ہونے کی شرط یہ ہے کہ "ایک سے زیادہ
معنی ہوں اور ان میں ایک معنی عمومی یا حقیقی ہوں اور دوسرے معنی اصطلاحی یا مجازی ہوں
اصطلاح سازی کی ضرورت زبان کو نئے علوم و فنون سے روشناس کرنے کے لیے ہوتی ہے
جس کا مطلب ہے کہ زبان کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ جب بلندیوں کو چھونے لگی اور اس نے ترقی کی کئی

---

[1] فرہنگ آصفیہ حصہ اول ص ۹۲

مدارج طے کر لیے مثلاً اس میں سر سید کے عہد میں ان کے رفقا کے ہاتھوں شاعری کی اصلاح
کے علاوہ اصناف سخن پر زور دیا گیا۔ کئی نئے اصناف مثلاً ناول، سوانح نگاری، تنقید
اور تحقیق، تاریخ نگاری، مضمون و مقالہ نگاری شروع ہوئی اس کے ساتھ ہی تراجم
کی افراط ہوئی۔ ادب کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو گیا۔ صنعتی انقلاب اور
یوروپ کے نشاۃ الثانیہ نیز انگریزی تہذیب نے نئے علوم و فنون اور سائنسی ضرورتوں
کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی سائنس اور ادب میں باہمی یگانگت کی فضا ہموار
ہوئی۔ عمرانیات، بحریات، جمادات وغیرہ سائنسوں سے ادب میں استدلال کیا جانے لگا
تب یہ ضرورت پیش آئی کہ نئی اصطلاحوں کو اردو میں وضع کیا جائے۔ سر سید اور ان کے
ساتھیوں نے انگریزی کے بے شمار الفاظ جوں کے توں قبول کر لیے بلکہ انھوں نے
اس پر اصرار بھی کیا کہ انگریزی کی مخصوص اصطلاحوں کو بھی ہمیں اردو میں برقرار رکھنا
چاہیے۔ بجائے اسکے کہ ہم ان کا عربی و فارسی کی اصطلاحوں کے ذریعہ ترجمہ یا تبادلہ کر لیں
انھوں نے کہا کہ ہر لفظ اپنا ایک پس منظر ایک روایت رکھتا ہے اسلیے اگر ہم اپنی زبان و
ادب میں تازگی و ترنم لانا چاہتے ہیں تو وہ الفاظ براہ راست بغیر کم و کاست زبان میں
داخل کر لینے چاہئیں۔ مثلاً کمسٹری کو سر سید نے علم کیمیات پر یہ کہہ کر ترجیح دی کہ کیمیا سے
ہمارا ذہن اس تصور کی طرف نہیں جاتا جس سے محض کمسٹری کہنے سے جاتا ہے وغیرہ۔

ان کے آخری دور کے ساتھیوں میں مولانا وحید الدین سلیم نے وضع اصطلاحات
کے اصول اختراع کیے۔ اسی زمانے میں مہدی افادی الاقتصادی نے افادات مہدی
میں انگریزی اصطلاحوں کے تراجم زبان میں داخل کیے یہ ایک بڑا کام تھا جو ایک باصلاحیت
آدمی نے خاصی بڑی حد تک سرانجام دیا، انھوں نے انگریزی کی بیشتر اصطلاحوں کو

عربی اصطلاحوں سے بدل دیا جن میں سے اکثر نہایت کامیاب کوششیں ہیں مثلاً انھوں نے
کلاسیکی ادب کو ادب القدما اور ادب عالیہ، ہائی کرٹی سزم کو تنقیدات سے اور
اوریجنلٹی کے لیے مادۂ اختراعی، لٹریری اکاڈمی کے لیے مجمع الفصحا، ماسٹرپیس
کو اختراع فائقہ، ڈی لکس ایڈیشن کو طبع خاصہ، کوڈ آف موریلٹی کو ضابطۂ اخلاق
رائل کورٹ کو شاہی گہوارۂ عیش، اگپ کو مطائبات ادب وغیرہ کہا، یہ کوشش ایک
فرد واحد کے ذہن کی خلاقی، دراکی، و براقی تھی باوجودیکہ انھوں نے اس میدان
میں اپنی طباعی کو کام میں لاکر بڑے لطیف اور مفید پہلو پیدا کیے انھوں نے بعض
بوسیدہ و پرانے الفاظ کے باسی پن کو دور کرنے کے لیے نئی اصطلاحیں وضع کر کے تازہ
کاری و نادرہ کاری کی ایک مثال قائم کی۔ مثلاً کتاب کو دوشیزۂ کاغذی کے لقب
سے نوازا، پردہ نشیں عورتوں کو گرفتارانِ قفس کے نام سے پکارا، نقاب کو چلمک کہا اور
جوڑے کو گرہِ شب کا نام دیا۔ اس اختراع ذہنی سے جمالیاتی احساس کی پذیرائی ہوئی زبان
کے دامن میں چھپنے اور نازک پھول آگئے تاہم نئے علوم نے علوم و فنون کا مطالعہ بیدار
مغزی اور حسن پرستی کے اس دائرے پر اکتفا نہیں کر سکتا تھا وہ کچھ اور چاہتا تھا۔
خوب سے خوب تر کی جستجو میں حیدرآباد میں قائم ہونے والا دارہ ادارہ بہت اہم ہے
جسے مرزا ہادی رسوا کی خدمات میسر آگئی تھیں اور جو اصطلاحات سازی کا ایک کارخانہ
سا تھا تاہم وہ اپنی شدت پسندی کا شکار ہو گیا۔ انکے بعد یہ کاروبار شروع بہت
دنوں تک سرد پڑا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ آزادی کے بعد تقسیم ملک کی انگریز نے جانے
اردو کے مکمل استعمال کا فیصلہ سنا دیا۔ ملکی آزادی کے گزشتہ پچیس برس میں اردو نے
جو سختی، تنگی اور عسرت میں یہ دن گزارے یہ زہرہ گداز سانحہ ہے نتیجہ میں اسکا ارتقاء

رک گیا، اس میں نئی اصطلاحیں اس لیے بار نہ پا سکیں کیونکہ نئے علوم کی اردو میں
تعلیم کا سرے سے کوئی بندوبست ہی نہیں رہا ایک طرح سے زبان و ادب کا تعلق جملہ علوم
و فنون سے کٹ کر رہ گیا۔ شکر ہے کہ آج اردو کا یہ دورِ ادبار ختم ہوتا جاتا ہے اب اس کی
اقبال مندی کا دور ہے وہ آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکلنے کے بعد مس خام سے کندن بن چکی
ہے اسلیے اب اردو اس بات کی متقضی ہو رہی ہے کہ جدید سائنس اور اردو ٹکنالوجی سے
نئے علوم و فنون سے اردو کے رشتے کو استوار کیا جائے۔ اور اس رشتے کی استواری کا
دارومدار اردو زبان و ادب میں نئی اصطلاحوں کی گڑھت کا مرحلہ ہے۔

تاہم نئی اصطلاحیں وضع کرنے کے لیے کچھ اصول ہمارے سامنے ضرور رہنے چاہئیں تاکہ ہم
اسی غلطی کا اعادہ کر کے اردو کی بدخدمتی کا ثبوت نہ دیں جو اس سے پہلے سرزد ہو چکی ہے۔

(۱) محض وہ الفاظ لیے جائیں جو استعمال میں آتے ہوں مردہ الفاظ کو جلانے یا اخفیا
کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے یہ الفاظ ہر اس زبان سے لیے جا سکتے ہیں جن سے اردو کا
تعلق ماضی یا حال میں رہا ہے۔ فارسی، عربی، ترکی، ہندی یا سنسکرت کے ایسے تت سم
جن میں سختی اور درشتگی نہیں ہے بے تکلف لیے جا سکتی ہے۔

(۲) عربی زبان میں موجود اصطلاحوں کو اردو میں برقرار رکھا جا سکتا ہے اس کے
ساتھ ہی ان سے اپنے خاص ترتیب و ترکیب کے مطابق مرکب اصطلاحیں بنائی جا
سکتی ہیں۔ ترکیب الفاظ کے لیے ہمیں محض ہند آریائی زبانوں کا طریق کار عربی و
فارسی سے مختلف ہے اپنانا چاہیے۔

(۳) عربی و فارسی کی وہی اصطلاحیں قبول کی جائیں جو سریع الفہم اور آسان ہوں کہ سانی کہا جا
یہ ہے کہ وہ زبان پر بغیر کسی دشواری کے رواں ہو سکیں مثال کے طور پر مہدی نے کلاسیکی ادب کو

ادب العالیہ اور ادب القدماء کا نام دیا۔ ان میں ادب القدماء زبانوں پر نہ چڑھ سکا ادب العالیہ
کسی حد تک چلن میں آیا پھر کلاسیکی خود زبان کا جزو بن گیا۔
(۴) انگریزی کے الفاظ جو زبان پر چڑھ جائیں اور ان کی ادائگی میں کوئی اجنبیت یا دقت
محسوس نہ ہو جوں کی توں لے لینے چاہئیں انکے لیے عربی یا فارسی اصطلاحوں کی گڑھت فضول اور
کاوش ہے۔ مثلاً مکبر الصوت کی اصطلاح لاؤڈ اسپیکر کیلیے زیادہ بار نہ پاسکی اسی طرح ریڈیو،
ٹیلیفون، ٹیلیگرام، اسٹیشن کو جوں کے توں لے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ان کیلیے الگ سے
اصطلاحوں کو گڑھنا توانائیوں کا غلط استعمال ہی ہو سکتا ہے۔
(۵) سائنسی اشیاء کے وہ نام جو موجدوں کے نام پر ہیں انکو برقرار رکھنا چاہیے تاکہ اشیاء
کے نام کے ساتھ موجد کا نام بھی ذہن میں آجائے یاد رکھنا آسان بھی ہو جاتا ہے۔
(۶) انگریزی کی بعض مفرد اصطلاحیں یونان یا ہندوستان دیو مالائی تصورات سے اخذ
کی گئی ہیں مثلاً امونیا وغیرہ ایسے الفاظ کو برقرار نہ رکھتے ہوئے ان اشیاء کے خواص اور صفات کے
مطابق ان کے نام رکھ لینے چاہئیں اس طرح وہ اشیاء اپنے خواص کے ساتھ جلد یاد ہو سکیں گی
اگر کسی دوسری زبان میں اس شئے کا نام اسکے خواص سے مختلف ہے تب بھی ہمیں اس کی
نئی اصطلاح مطابق خواص وضع کر لینی چاہیے۔
(۷) اردو میں ضروری نہیں کہ انگریزی ہی کی اصطلاح لی جائے اگر انگریزی کے کسی دوسری
میں بھی کسی ایک شئے کے لیے کوئی دوسری اصطلاح موجود ہے اور وہ انگریزی سے زیادہ
سریع الفہم اور آسان ہے تو اسے انگریزی اصطلاح پر ترجیح دینی چاہیے۔
(۸) اگر انگریزی اصطلاح اور اردو میں مترادف اصطلاح میں بنائی بہتر ہے مگر
یہ ہمیشہ ضروری نہیں ہے۔

(۹) اگر انگریزی اصطلاح اور اردو میں ہماری خود ساختہ اصطلاح دونوں
یکساں طور پر مبہم ہوں تو کوئی ضروری نہیں کہ ہم انگریزی اصطلاح کو اپنی
اصطلاح پر ترجیح دیں۔
مفرد اصطلاحوں کی گڑھت میں ہمیں مختصراً یہ کہنا چاہیے کہ کسی بھی علم کی مفرد
اصطلاحیں ایسی ہی وضع کرنی چاہئیں جو عام فہم اور آسان ہوں بغیر کسی دشواری
کے زبان پر رواں ہو سکیں جن میں سختی اور کرختگی نہ ہو بلکہ ایک قسم کا لوچ اور
لچک ہو جو ضرورت کی کفالت کے ساتھ ساتھ دیدہ و دل کو شاد کام بھی کر سکیں یہ
کسی بھی علوم و فنون سے لی جا سکتی ہیں۔
یوں عربی، فارسی اور ہندی جن کا تعلق اردو سے بہت گہرا ہے ان زبانوں کی
اصطلاحیں لینا اردو کے مزاج کے عین مطابق ہوگا۔ انگریزی اصطلاحوں کو جوں کا توں
بھی لیا جا سکتا ہے اور ان کا لفظی ترجمہ بھی بعض حالات میں برا نہیں ہوتا۔
• اصطلاحات کی دوسری قسم مرکب اصطلاحات ہے انکے بارے میں مولوی
وحید الدین سلیم کی "وضع اصطلاحات کے اصول" سے یہاں اپنی ضرورت کے مطابق
کچھ اصول نقل کیے جاتے ہیں۔
۱۔ مولوی صاحب کے مطابق مرکبات کی انھیں اقسام کو استعمال کرنا چاہیے جو اردو
میں عام ہو چکی ہیں یا رواج عام سے ہٹ کر کوئی اصطلاح نہ بنائی جائے۔ یہ مرکب اصطلاحیں
عربی، فارسی، ہندی یا مخلوط دو طرح الفاظ و تراکیب سے بنائی جا سکتی ہیں۔
۲۔ اگر کسی مرکب اصطلاح کے دونوں اجزاء ہندی ہوں یا دونوں جز فارسی ہوں یا ایک جز
ہندی کا اور ایک فارسی کا ہو اور ان جزوں میں حرف علت یا مصوتے (VOWELS)

۳۔ مرکب کو مختصر کرنے کیلیے اگر اس کے پہلے جزو کا آخری حرف اور دوسرے جزو کا پہلا حرف ایک ہو تو انمیں سے ایک کو حذف کر دینا چاہیے اسطرح وہ زبان پر رواں بھی ہو جائیگا اور اس سے نئے مشتقات بھی بن سکیں گے مثلاً کرم جو فارسی لفظ ہے اسکے ساتھ "مار" کا لفظ اس طرح جوڑ دیا جائے کہ ایک میم کو حذف کر کے "کرمار" بنایا جائے۔

۴۔ اگر مرکب کے پہلے جزو کا آخری حرف اور دوسرے جزو کا پہلا حرف قریب المخرج ہوں مثلاً دونوں (ت، د) یا (ک، گ) وغیرہ ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو حذف کر دینا چاہیے مثلاً ایک + گانہ = یگانہ یا ایک حرف کو اڑا کر دوسرے پر تشدید لگا دیں۔ مثلاً شب + بو = شبو۔ یا ان میں سے کسی ایک حرف میں اگر ثقل ہو اس کی جگہ کوئی دوسرا حرف بدل دیں مثلاً ہٹ + تال = ہڑتال۔

۵۔ اس اصول کے تحت مولوی صاحب نے کئی شقیں رکھی ہیں۔

۱۔ اگر ہائے مختفی مرکب کے کسی جزو کے آخر میں ہو تو اس کو گرا دینا چاہیے۔ مثلاً شیشہ سے شیش، کندہ سے کند۔

۲۔ ہندی کے ایسے الفاظ جن میں نون غنہ ہو اور اس سے پہلے کوئی حرف علت ساکن ہو اگر کسی مرکب میں بطور پہلے جزو کے آئیں تو حرف علت کے نون غنہ کو بھی گرا دینا چاہیے مثلاً پانچ سے "پنچ" کندہ سے کند۔

۳۔ فارسی زبان کے ایسے الفاظ جو مرکب کے شروع میں آئیں اور جن کے آخر میں دو حرف صحیح ساکن ہوں، ضرورت کے وقت ان کے آخری حرف کو گرا دینا چاہیے مثلاً گرگ سے گر۔

(۴) فارسی زبان کے ایسے الفاظ جنکے آخر میں ضمہ ہو اور اس سے پہلے مصوتہ ہو اگر وہ کسی مرکب

۹۔ یہ سب اصول تغیرِ اجزا کے متعلق ہیں مگر جن مرکبات کے اجزا میں تغیر واقع نہ ہو یا تغیر کوئی مناسب ہو تو بغور دیکھنا چاہیے کہ اجزا کے ملنے سے جو مرکب تیار ہوا ہے وہ ثقیل تو نہیں ہے۔ اگر ثقیل نہیں ہے اور زبان پر آسانی سے رواں ہو سکتا ہے تو اس مرکب کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دینا چاہیے لیکن اگر ثقیل ہے تو پھر دونوں اجزا کے درمیان رابطے کے لیے الف یا واؤ یا یاء کا اضافہ کرنا چاہیے تاکہ مرکب ثقل دور ہو۔

۱۰۔ انگریزی زبان میں ایک لفظ سے جتنے سبقلائی یا مرکب الفاظ بنائے گئے ہوئے یہ ضروری نہیں کہ اردو میں بھی اسکے مقابل ہی لفظ سے تمام سبقلائی اور مرکب الفاظ بنائے جائیں۔ اس تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ ترقی یافتہ زبان میں دو قسم کی اصطلاحیں ہوں، ایک مفرد دوسری مرکب۔ یہ اصطلاحیں شعوری کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لیے انھیں وضع کرتے وقت زبان کے مزاج اس کے کینڈے اس سابقے وغیرہ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے وہ ضرورت کے سبب وضع کی جاتی ہیں مگر اختراع میں احساسِ جمال کا خون نہیں ہونے دینا چاہیے وہ سبک، رواں ہوں اور آسانی سے ذہن سے چپک جانے والی ہونی چاہیے۔ اردو میں یہ کوشش حیدرآباد میں کی گئی مگر انتہا پسندی کے سبب زیادہ کارگر ثابت نہ ہو گی۔ اسکے بعد زبان کا رشتہ نئی ضرورت اور نئے علوم و فنون سے ٹوٹ گیا اس لیے اسکو ذیل میں کوئی علمی کام بہت کم ہو سکا۔ اب اسکی ضرورت ہے کہ یہ کام پوری تن دہی محنت ژرف بینی اور طبیعت کی سلامت روی کے ساتھ سرانجام پائے۔

لہ ماخوذ از "وضع اصطلاحات" از مولوی وحید الدین سلیم۔

اسکے علاوہ ایک دوسرا طریقہ اعضائے صوت (ORGANS OF SPEECH) کا تفصیلی مطالعہ ہے اس کی رو سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سی آواز کس عضو سے نکلتی ہے۔ اس مطالعہ میں محض انھیں آوازوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے جو بامعنی ہوتی ہیں اور معنی کی تفریق میں مددگار بھی ہوتی ہیں۔ بے سری اور بے معنی آوازوں سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

انسانی اعضائے تکلم کا بنیادی کام آوازیں پیدا کرنا نہیں ہے بیشتر ثانوی کام ہے مثلاً آوازیں پیدا کرنے والے اعضا میں ناک، ہونٹ، دانت، زبان، گلا، حلق، اور صوتی لب (VOCAL CORDS) بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ان کے علاوہ پھیپھڑے اور پھیپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا سب سے اہم اداکار ہیں انسانی اعضا سے پیدا ہونے والے آوازوں کے اس ڈرامے میں یا آوازوں کو پیدا کرنے کا یہ عمل ہر انسان میں مشترک ہے اور کیونکہ ہر شخص کے معمول میں داخل ہے اس لیے اس کا مطالعہ اپنے اندر ہر شخص کے لیے بہت دلچسپی کے سامان رکھتا ہے مثلاً۔

جب ہم کوئی آواز نکالتے ہیں تو ہوا منھ اور ناک سے باہر نکلتی ہے یہ ہوا جو پہلے ہمارے پھیپھڑوں میں موجود ہوتی ہے آواز نکالتے وقت پھیپھڑوں سے نکلتی اور اپنے راستے میں آنے والے کئی حصوں سے ٹکراتی یا انھیں چھوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے یہاں تک کہ منھ یا ناک سے باہر نکل جاتی ہے اور اس طرح ہم جو آواز نکالنا چاہتے ہیں نکل جاتی ہے۔ مگر اپنی اس گزرگاہ میں وہ جہاں جسم کے کئی حصوں کو متاثر کرتی ہے وہیں خود بھی متاثر ہوتی ہے ہوا کی اپنے راستے میں اس اثر پذیری کو علماء لسانیات نے دو قسموں میں بانٹا ہے۔

ایک قسم مصمتے (CONSONANT) کہلاتی ہے دوسری قسم مصوتے (VOWELS) کہلاتی ہے اگر ہوا کے راستے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ پائی جائے تو وہ آواز مصمتے (CONSONANT) کہلائے گی اگر ہوا کے رستے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں پائی جائے تو وہ آواز (VOWEL) کہلائے گی۔

مصمتے کی قسمیں

مصمتہ یا ہوا کے رستے میں یہ رکاوٹ پانچ طرح سے (CONSONANT) ہو سکتی ہے۔ (۱) ہوا کے نکلنے کا راستہ آواز نکالتے وقت مکمل طور پر بند ہو جائے اور ایسے میں ہوا کا دباؤ منھ یا گلے میں ہو اس وقت جو آواز پیدا ہوگی اسے بندشی (PLOSIVES یا STOPS) کہتے ہیں۔ پا، با، ٹا، ڈا، کا، گا (پ، ب، ٹ، ڈ، ک اور گ) بندشی آوازیں ہیں۔

۲۔ ہوا کے راستے میں رکاوٹ ڈال کے ایک معمولی سی دراز یا پتلا سا راستہ ہوا کے نکلنے کے لیے کھلا رہ جائے تاکہ ہوا باہر نکل سکے مگر ایسا کرتے وقت طاقت بھی صرف کرنی پڑے اس طور پر نکلنے والی آوازیں صفیری (SPIRANTS) کہلاتی ہیں مثلاً فا، وا، سا، زا، شا، ژا، خا، غا، (ف، و، س، ز، ش، ژ، خ، غ)

۳۔ آواز نکالتے ہوئے منھ کے درمیانی حصے میں رکاوٹ آ جائے لیکن زبان کے ایک طرف یا دونوں طرف کا راستہ کھلا رہے یعنی آواز نکالتے ہوئے اگر ہوا پہلو سے نکالی جائے اس پہلو سے نکلنے والی آواز کو پہلوئی (LATERLS) کہا جائے گا۔ اردو میں ایسی آواز محض (لا) یا (ل) کی ہے۔

۴۔ آواز نکالتے ہوئے اگر ہوا منھ میں کوئی لچک دار حصہ چھوئے تو ہوا کے باہر کے رخ آزادانہ بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور اس تضاد کے

نتیجے میں جو آواز پیدا ہوگی اسے ارتعاشی (TRILL) کہتے ہیں ارتعاش کی یہ کیفیت اگر نہایت درجہ مختصر ہو تو ارتعاش کے بجائے محض ایک ٹھپک ہوگی تب اسے ٹھپک دار (FLAP) آواز کہتے ہیں مثلاً ر اور ڑ (را اور ڑا) کی آوازیں۔

۵۔ آواز نکالتے ہوئے جب منھ کو مکمل طور پر بند کر لیا جاتا ہے آواز بجائے منھ کے ناک کے راستے سے نکالی جاتی ہے تو ایسی آواز کو انفی یا نکملی (NASAL) کہا جاتا ہے اردو کی ما اور نا (م اور ن) نفی آوازیں ہیں۔

مقام مداخلت کے اعتبار سے مصمتوں کی تقسیم

مصمتے پیدا کرنے کے لیے پانچ اعضائے جسم سب سے زیادہ مددگار ہوتے ہیں۔

۱۔ کچھ مصمتے ہونٹوں سے پیدا ہوتے ہیں انھیں لبی (LABIAL) مصمتے کہا جاتا ہے مثلاً پا، با، پھا، بھا، فا، وا اور ما (یعنی پ، ب، پھ، بھ، ف، و اور م)

۲۔ کچھ مصمتے زبان کی نوک سے پیدا ہوتے ہیں انھیں نوکیلی (APICAL) کہا جاتا ہے مثلاً تا، دا، ٹا، ڈا، تھا، دھا، ڈھا، ٹھا، سا، زا، لا، را، ڑا، نا (ت، د، ٹ، ڈ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، س، ز، ل، ر، ڑ اور ن۔

۳۔ کچھ مصمتے یعنی آوازیں تالو سے نکلتی ہیں اس لیے انھیں تالوئی (PALATAL) کہا گیا ہے مثلاً چا، جا، چھا، جھا، شا اور ژ (چ، ج، چھ، جھ، ش، ژ)

۴۔ کچھ مصمتے یعنی آوازیں تالو کے پچھلے حصے (غشا) سے نکلتی ہیں اسلیے انھیں غشائی VELAR کا نام دیا گیا ہے مثلاً کا، گا، کھا، گھا، خا، غا (ک، گ، کھ، گھ، خ، غ)

۵۔ کچھ آوازیں حلق سے نکلتی ہیں اس لیے انھیں حلقی (GLOTTAL) کے نام سے

یاد کیا جاتا ہے اردو میں حلقی دو آوازیں ہیں ایک قا یا ق، دوسری ہ یا ہا کی مذکورہ تمام آوازیں جو مصمتے کہلاتی ہیں دو طرح کی ہوتی ہیں مسموع یا غیر مسموع۔

مسموع یا غیر مسموع آوازوں کی اس تقسیم کو سمجھنے کیلئے ہمیں یہ اور جاننا چاہیے کہ منھ ناک، دانت، ہونٹ، زبان، گلے اور حلق کی طرح "صوتی لب" بھی ہوا کے راستے میں ہوا سے اثر انداز ہوتے ہیں ان صوتی لبوں کو انگریزی میں (VOCAL CORDS) کہتے ہیں جب ہم کوئی بھی آواز نکالتے ہیں تو پھیپھڑوں سے نکلنے والی ہوا انھیں صوتی لبوں سے گزر کر آگے بڑھتی ہے یہ صوتی لب نرخرے کی اوپری سرے پر آپس میں جڑے ہوئے دو نہایت لچکدار پٹھے ہیں کیونکہ انکی شکل ہونٹوں سے ملتی ہے اسلیے انھوں صوتی لب کہا گیا ہے۔

صوتی لبوں کا درمیانی فاصلہ حلق (GLOTTIS) کہلاتا ہے جب ہوا کے راستے کو یہاں بند کر دیا جاتا ہے تو اس وقت عربی ہمزہ کی آواز نکلتی ہے جسے مذکورہ بالا تقسیم کے مطابق بندشی حلقی (یعنی حلق میں ہوا کی رکاوٹ) کہا جاتا ہے)

مسموع آواز:- لیکن دوسری تمام آوازیں پیدا کرتے ہوئے اگر صوتی لبوں میں کھنچاؤ پیدا ہو جائے تو ہوا ان سے گزرتے ہوئے ان کے نچلے سروں کو جھنجھنا دیتی ہے اس جھنجھناہٹ سے ایک زناٹے کی آواز نکلتی ہے اسی آواز کو اردو میں مسموع (VOICED) کہتے ہیں۔

غیر مسموع آواز:- اس کے برخلاف اگر صوتی لبوں میں کوئی کھنچاؤ پیدا نہ ہو اور آواز نکلے تو اس آواز کو غیر مسموع (VOICELESS) کہا جاتا ہے۔

تمام مصوتے ہمیشہ مسموع ہوتے ہیں جبکہ مصمتے مسموع اور غیر مسموع دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مصمتوں کی اقسام کے لیے ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جو بات کو صاف اور ذہن نشین کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مصمتے (CONSONANTS)

	حلقی		غشائی		تالوی		نوکیلی		لبی		
مسموعہ	غیر مسموعہ	مسموعہ	غیر مسموعہ	مسموعہ	غیر مسموعہ	مسموعہ	غیر مسموعہ	مسموعہ	غیر مسموعہ		
.	ق	گ	ک	ج	چ	ٹ ڈ	ت د	ب	پ	بندشی سادہ	STOPS
-	.	گھ	کھ	جھ	چھ	ٹھ ڈھ	تھ دھ	پھ	بھ	ہکار	
ہ	غ	خ	ژ	ژ	ش	ز	س	و	ف	صفیری	SPIRANTS
						ل	ل			پہلوی	LATERALS
						ڑ	ر			ارتعاشی	TRILLS
						ن	ن	م		انفی یا نکیلی م	NASALS

مذکورہ بالا نقشے کے مطابق کل اردو مصمتے اس طرح ہیں۔

پ ت ٹ چ ک — پھ، تھ، ٹھ چھ کھ

ب د ڈ ج گ — بھ دھ ڈھ جھ گھ

ف س ش خ ہ

و ز ژ غ

ل ی

ر ڑ

اردو کی ہکار آوازیں بھ پھ بھ، تھ دھ، ٹھ ڈھ، چھ جھ، کھ گھ، لھ، مھ، نھ، ہکار آوازیں ہیں۔ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، اور ڑ ہیں جنھیں اردو نے ہند آریائی کے توسط سے دراویدی خاندان کی زبانوں سے لیا ہے۔

خالص عربی ہیں۔ ق اور غ کی آوازیں، خالص فارسی ہیں۔ خ، ژ، ف، میں کبھی کبھی فارسی ژ بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً مژدہ، جانفزا، مژگاں دراز وغیرہ میں۔

مصوتے یا صوتے (VOWELS) ان آوازوں کو کہا جاتا ہے جنھیں نکالنے کے لیے ہوا کی گزرگاہ میں منھ کا اندرونی حصہ نسبتاً یا مقابلتاً کھلا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہوا کا راستہ نہ تو بند ہوتا ہے نہ تنگ ہوتا ہے نہ آگے پہلو سے گزر جاتا ہے۔ نہ کوئی حصہ اس کے گزرنے سے مرتعش ہوتا ہے بلکہ ہوا بغیر کسی مزاحمت یا رکاوٹ کے باہر نکل جاتی ہے دراصل مصوتے میں ہوا کی گزرگاہ کھلی چھوڑ دی جاتی ہے مگر زبان اور ہونٹوں کی حرکتوں اور جنبشوں سے اثر ڈالا جاتا ہے۔

۱۔ مصوتوں کے مطالعے میں زبان کی درازی (ADVANCEMENT OF TONGUE)

۲۔ زبان کی اونچائی (HEIHT OE TONGUE)

۳۔ اور ہونٹوں کی حالت یعنی گول یا پھیلے ہوئے (ROUNDED OR UNROUNDED) انھیں تین چیزوں کا مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے انھیں بنیادوں پر مصوتوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔

۱۔ زبان کی درازی والے نکتے کے مطابق کسی مصوتے کو نکالتے وقت زبان تین طرح سے کام کرتی ہے اگر زبان کی نوک تالو کے سخت حصے کی طرف لگے تب اگلے مصوتے پیدا ہوتے ہیں۔

اگر زبان کا درمیانی حصہ تالو سے لگے تب بیچ والے مصوتے پیدا ہوتے ہیں۔

اگر زبان کا پچھلا حصہ تالو سے لگے تب پچھلے مصوتے پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ زبان کی اونچائی سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی آواز کے پیدا کرنے میں زبان کا اگلا حصہ تالو کی طرف اٹھے مگر اسے چھوئے نہیں تو وہ نکلنے والی آواز اگلا مصوتہ (FRONT VOWEL) کہلائے گی۔

اگر زبان کا اگلا حصہ زیادہ نہیں ذرا سا اٹھے تو نکلنے والی آواز کو اگلا نیچا مصوتہ

(LOW FRONT VOWEL) کہیں گے۔

اگر زبان کا اگلا حصہ تالو کی طرف زیادہ سے زیادہ اٹھے تو اسطرح جو آواز نکلے گی اسے اونچا مصوتہ (HIGH FRON VOWEL) کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ زبان کے تالو کی طرف اٹھنے میں صرف اٹھنا شرط ہے۔ اگر زبان تالو سے لگ جائے گی تو ہوا کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اور اس طرح وہ آواز مصوتہ نہیں مصمتے کی ہوگی۔

اردو میں ان کی تعداد "۴" اس طرح ہے۔

ی۔ (کا) ـے (زیر) ـَ (زبر)۔

(کا) (e) (I) ae

دینا سیر سَیر دن

پچھلے مصوتے (BACK VOWELS) زبان کے پچھلے حصے سے جو آوازیں اس طرح پیدا کی جاتی ہیں کہ ہوا کے راستے میں رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی انھیں پچھلے مصوتے کہا جاتا ہے اردو میں یہ اس طرح ہیں۔

ا ـَ و وُ ـُ اُو

u U ɔ Ɑ a

ऊ उ ओ औ अ

اب آدلہ ادلہ جوش گھل۔ بھول

اردو کے ہم پچھلے مصوتے ہونٹوں کو گول کرکے ادا کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

او، اَو، او اور اُو

اردو کے اگلے مصوتے ہونٹوں کو گول کیے بغیر ادا ہوتے ہیں۔

نیم مصوتے:۔ اگر ایک ساتھ دو مصوتے آجائیں تو ان میں سے بیشتر صورتوں میں ایک مسموع اور دوسرا غیر مسموع ہوتا ہے یہ غیر مسموع مصوتہ نیم مصوتہ (SEMI VOWEL) کہلاتا ہے یہ اردو میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً (YSS) اور دن۔

فونیم بلر (PHONEMES) انسانی اعضائے صوت بے شمار آوازیں پیدا کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ زبان ان ان گنت آوازوں میں کچھ قبول کرلیتی ہے کچھ کو ترک کر دیتی ہے ان قبول کرنیوالی آوازوں میں بھی کچھ بے معنی ہوتی ہیں کچھ بامعنی ایسی بامعنی آوازوں کو جو معنی کی توضیح میں مدد دیتی ہیں لسانیات کی اصطلاح میں فونیم کہا گیا ہے۔ انگریزی میں فونیم کی مختصر تعریف (A FUNCTIONAL UNIT OF SOUND) کی گئی ہے یعنی وہ آوازیں جو بردہیا معطل نہیں ہیں بلکہ کارآمد ہیں اور ان کے کارآمد ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ان میں سے ایک کی جگہ دوسری کو لگا دیا جائے تو معنی میں فرق آجائے مثلاً کھال، بال، مال، حال، ڈھال، رال، فال وغیرہ ایک ہی طرح کے جوڑ ہیں مگر جوں ہی ایک کی جگہ دوسری آواز لائی گئی آواز کے معنی میں فرق آگیا۔ باوجودیکہ اس کے اور تمام آوازیں جوں کی توں برقرار رہیں۔

لسانیات کی سائنس کے ذریعہ زبانوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ زبان کے ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے اور اسکی حقیقت سے پردہ ہٹایا جاتا ہے تاکہ زبان کا ڈھانچہ اور اس کے سنیڈھے کو سمجھنے میں آسانی ہو اور تاکہ اس کا دوسری زبانوں سے رشتہ ناتہ روشنی میں آسکے اسی لیے فونیم کے علاوہ آواز کے کمتر حصے (MINIMAL UNIT) جیسے لسانیات میں (MORPHEME) کہا گیا ہے۔ اس کو بھی الگ

خانوں میں بانٹا جاتا ہے اس طرح کے تجزیے و تحلیل سے زبان کو سمجھنا آسان بھی ہو جاتا ہے اور زبان کا سائنسی جواز بھی سامنے آتا ہے۔ یہ کام دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں بڑی لگن سے ہو رہا ہے گو اردو میں یہ اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے تاہم حوصلہ شکن نہیں ہے مطالعہ کا یہ جدید طریقہ بصیرت کی روشنیوں کو عام کرنے میں بہت ہی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

کتابیات

فن سوانح نگاری

سیر المصنفین (مرتبہ) (حصہ اول) — محمد یحییٰ تنہا

اردو اسالیب نثر

ارباب نثر اردو (زیر طبع)

کلیات دلمیر (زیر طبع) — منور خاں دلمیر میرٹھی

۱۔ زبان اور علم زبان — از پروفیسر عبد القادر سروری
۲۔ پنجاب میں اردو — " پروفیسر حافظ محمود شیرانی
۳۔ ہندوستانی لسانیات — " ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۴۔ اردو شہ پارے — " ایضاً
۵۔ دکنی ادب کی تاریخ — " ایضاً
۶۔ اردو لسانیات کا خاکہ — " پروفیسر احتشام حسین (مرتب)

۷۔ ہند آریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے — از ایضاً (شمولہ رسالہ اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر)
۸۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو — " پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۹۔ اردو زبان کا آغاز و ارتقا — " ڈاکٹر شوکت سبزواری
۱۰۔ وضع اصطلاحات — " مولوی وحید الدین سلیم
۱۱۔ افادات سلیم — " ایضاً
۱۲۔ فرہنگ آصفیہ (حصہ اول) — " مولوی سید احمد دہلوی
۱۳۔ دلی کا دبستان شاعری — " پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۱۴۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری — " ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
۱۵۔ دو ادبی اسکول — " علی جواد زیدی
۱۶۔ انتخاب تاریخ — " جناب رشید حسن خاں (مرتب)
۱۷۔ لسانیات اور اردو — " سید محمود الحسن رضوی
۱۸۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو — " پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۱۹۔ اردو کی آوازیں — " ڈاکٹر گیان چند جین (شمولہ اردو ادب شمارہ ۴۵)
۲۰۔ دیوان جعفر زٹلی — " میر جعفر زٹلی
۲۱۔ سرسید اور ان کے رفقاء کا نثری کارنامہ — " ڈاکٹر سید عبد اللہ

۲۲۔ علی گڑھ میگزین " علی گڑھ تحریک نمبر

۲۳۔ شعرالعجم (حصہ چہارم) " مولانا شبلی نعمانی

۲۴۔ OUT LINE OF LINGUISTIC BY BLOCH & TRAGER

۲۵۔ A COURSE IN MODREN LINGUISTIC BY HOCKETT

۲۶۔ A PHONETIC & PHONOLIGICAL— BY M.H. KHAN

۲۷۔ LINGUISTIC SURVEY OF INDIA BY GRIERSON

۲۸۔ URDU PROSE INFLUENCE ETC BY S.M. ABDULLAH

آپ کی کتاب جدید اُردو لسانیات شائع ہوئی ۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے اس قابلِ قدر اشاعت کے موقع پر مجھے بھی یاد رکھا۔

پروفیسر محمد حسن
صدر شعبۂ اُردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

آپ نے یہ کتاب (اُردو اسالیبِ نثر) بڑی محنت سے لکھی واقعی اُردو ادب میں اضافہ ہے .... دراصل ایسی سنگ لاخ زمینوں کا انتخاب کچھ اہلِ میرٹھ کا ہی اختصاص اور شعار رہا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی
مدیر شہیر۔ نیا دور۔ کراچی (پاکستان)

ارے آپ نے تو فرمائش کو عملی جامہ پہنا دیا۔ مبارک باد !

استاذ الاساتذہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

آپ کی تازہ تصنیف نے مجھے بے پناہ متاثر کیا۔ آپ نے سخت محنت کی ہے جو قابلِ داد ہے ایک خشک موضوع کو اپنی موزونیٔ طبع اور شگفتہ طبیعت سے شاداب کیا ہے۔

پروفیسر نجم الحسن نقوی

آپ کی کتاب جدید اُردو لسانیات شائع ہوئی ۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے اس قابلِ قدر اشاعت کے موقع پر مجھے بھی یاد رکھا۔

پروفیسر محمد حسن

صدر شعبۂ اُردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

آپ نے یہ کتاب (اُردو اسالیبِ نثر) بڑی محنت سے لکھی واقعی اُردو ادب میں اضافہ ہے .... دراصل ایسی سنگ لاخ زمینوں کا انتخاب کچھ اہلِ میرٹھ کا ہی اختصاص اور شعار رہا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

مدیرِ شہیر۔ نیادور۔ کراچی (پاکستان)

ارے آپ نے تو فرمائش کو عملی جامہ پہنا دیا۔ مبارک باد !

استاذ الاساتذہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

آپ کی تازہ تصنیف نے مجھے بے پناہ متاثر کیا۔ آپ نے سخت محنت کی ہے جو قابلِ داد ہے ایک خشک موضوع کو اپنی موزونیٔ طبع اور شگفتہ طبیعت سے شاداب کیا ہے۔

پروفیسر نجم الحسن نقوی

فنِ سوانح نگاری

اسالیبِ نثر

سیر المصنفین (دو مرتبہ

لسانیات